عرب اور اسرائیل

منورما دلوان

عرب اور اسرائیل

(المیہ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں)

منور ما دیوان

اس کتاب میں

عرب اسرائیل جنگ کے کئی سربستہ راز
عربوں کے خلاف سامراجی سازشیں
ارض مقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کی تاریخی کڑیاں
عرب مہاجرین کی آنسو بھری کہانی
عربوں کی جدوجہد آزادی کی ولولہ انگیز داستان
اسرائیلی "ترقی" اور طاقت کی اصل حقیقت

صیہونی فلسفی یا ہٹلر کے استاد
اقوام متحدہ کا سب سے بڑا مجرم
عرب اور اسرائیل — ہندوستان کے لئے
مغربی ایشیا کا مستقبل، جنگ یا امن؟
ہندوستان کدھر اور کیوں؟

اور
متعدد نادر تصاویر اور معلوماتی نقشے

قیمت دو روپے پچاس پیسے

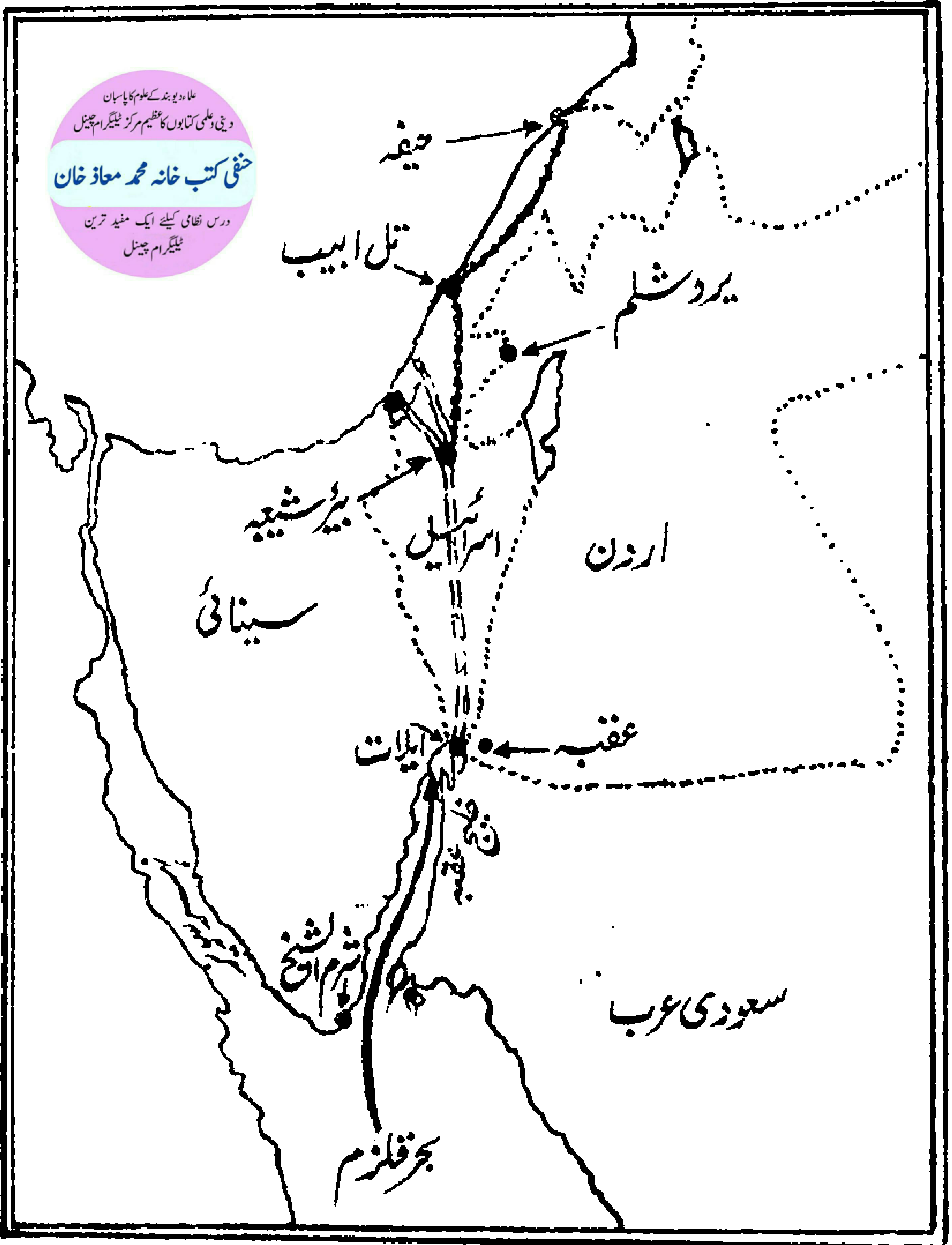
افروایشین پبلیکیشنز
سی-۷۰ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی-۱۳
فون نمبر ۶۱۹۶۱۵

قارئین کے نام

محترم ڈاکٹر سید محمود کے مفصل اور جامع پیش لفظ کے بعد یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہتی کہ یہ کتاب میں نے کیوں لکھی اور اس میں کیا کہنا چاہتی تھی، کتاب لکھتے وقت میری کوشش صرف اتنی تھی کہ ان غلط فہمیوں کو دور کیا جا سکے جو اسرائیلی سامراجیوں کی طرف سے دنیا بھر میں عموماً اور ہندوستان میں خصوصاً پھیلائی جا رہی ہیں ان غلط فہمیوں کے پھیلنے سے امن، آزادی، حق اور انصاف کے تقاضے بھی مجروح ہوں گے اور ہندوستان کے قومی مفاد کو بھی ضرب پہنچے گی، مجھے آپ کی رائے کا انتظار رہے گا کہ یہ کوشش کامیاب ہوئی ہے یا نہیں۔ اس کتاب کے اردو ترجمے کے سلسلے میں میں برادرم احمد رشید شروانی (الہ آباد) کی بے حد شکر گذار ہوں جنہوں نے میری اردو کو بڑی محنت کے ساتھ اس حد تک سنوارا اور نکھارا کہ زبان میں واقعی اصل کا رنگ آ گیا، اپنے محترم بزرگوں ڈاکٹر عابد حسین اور جناب مالک رام کی بھی میں بے حد ممنون ہوں جو اپنے قیمتی مشوروں سے ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے ہیں۔ "ملاپ" کے چیف ایڈیٹر شری رنبیر اور شمع گروپ کے ایڈیٹر یونس دہلوی صاحب کا بھی میں دلی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں یہ حضرات نہ صرف مغربی ایشیا پر میری تحریروں کو بڑی فراخدلی کے ساتھ شائع کرتے رہے ہیں بلکہ انہوں نے بڑی خوشی سے مجھے اجازت دی ہے کہ میں نے حال ہی میں روزنامہ "ملاپ" اور ماہنامہ "بانو" کے لئے جو خصوصی مضامین لکھے تھے ان کے کچھ حصے اس کتاب میں استعمال کروں۔

منور ما دیوان

عرب دنیا کے سینے میں استعماری خنجر



پیش لفظ

ڈاکٹر سید محمود ممبر پارلیمنٹ

شریمتی منورما دیوان کے دل میں ظلم سے نفرت ہے وہ جہاں بھی ہو، اور مظلوموں سے ہمدردی ہے وہ جہاں بھی ہوں، وہ سب کے ساتھ انصاف چاہتی ہیں اور ناانصافی سے خواہ وہ کسی کے ساتھ کی جائے ان کو نفرت ہے اور ان ہی وجوہ کی بنا پر خود اپنے ملک میں جب وہ اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی کا برتاؤ دیکھتی ہیں تو ان کو تکلیف ہوتی ہے ان کا قلم جنبش میں آجاتا ہے اور عرب اسرائیل کا مسئلہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے، انہوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھانے سے پہلے ان ملکوں کا سفر کیا اور خود وہاں کے حالات دیکھے اور اس مسئلہ کے ہر پہلو پر پورے طور پر واقفیت حاصل کی اور جب ان کو یقین ہو گیا کہ اسرائیل عربوں کے لئے ایک جبر و ظلم کی مشین ہے اور اس ظلم کی مشین کے کل پرزے امریکہ اور انگلستان میں بنتے ہیں۔

شریمتی منورما دیوان سے یہ صریح بے انصافی اور ظلم نہ دیکھا گیا اور ان کا قلم جنبش میں آیا، وہ عرب اسرائیل مسئلہ پر پوری معلومات پہلے ہی سے حاصل کر چکی تھیں، انہوں نے ایک مختصر سا انگریزی کتابچہ اہلِ ملک کی معلومات کے لئے فوراً لکھ کر شائع کرایا، اس

وقت یہی کتابچہ زیر نظر ہے۔ اب اس کا اردو ترجمہ شائع کر رہی ہیں جسے مزید اضافے اور ترمیم نے اور بھی زیادہ قابل قدر بنا دیا ہے۔ جتنی ضروری معلومات ایک عام آدمی کو جو عرب اسرائیل مسئلہ کو سمجھنا چاہتا ہے ہونی چاہیئے وہ سب انہوں نے مہیا کر دی ہیں، جو شخص تفصیلی حالات کے لئے وقت نہیں نکال سکتا اس کی معلومات کے لئے اور اس مسئلہ کو سمجھ لینے کے لئے اس چھوٹی سی کتاب میں کافی مواد مل جائے گا، منورما دیوان نے مسئلہ کا کوئی پہلو چھوڑا نہیں ہے اور مختصر مگر دلچسپ طریقہ پر ہر پہلو پر بحث کی ہے۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ عرب اور یہودیوں کا مسئلہ ہے یعنی دو مذاہب کا جھگڑا ہے اسلام اور یہودی، حالانکہ ایسا بالکل نہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ اپنے زمانۂ عروج میں مسلمانوں نے ہر جگہ یہودیوں کو عیسائی ظلم و جبر سے بچایا۔ مثال کے طور پر ہسپانیہ کا ذکر کافی ہوگا جہاں یہودیوں پر انتہائی ظلم و جبر ہو رہا تھا اور عربوں نے یہودیوں کو ظلم سے نجات دلائی اور کئی سو برس تک یہودی اس ملک میں عربوں کی حکومت کے تحت نہایت امن و امان کی زندگی گذارتے رہے، آج بھی جبکہ اسرائیل اور عربوں میں دشمنی اس درجہ بڑھی ہوئی ہے، ایک اچھی خاصی تعداد یہودیوں کی مصر اور دیگر عرب ممالک میں رہ رہی ہے اور اسرائیل دشمنی کے باعث ان پر کسی طرح کا تشدد نہیں کیا جاتا اور وہ ان عرب ممالک میں امن و امان کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور خوش ہیں۔ اسرائیلی یہودی ضرور ہیں لیکن وہ یہودیوں کا ایک جارحانہ فرقہ ہے جن کو مذہب سے کوئی خاص لگاؤ نہیں اور اس فرقہ کو آسٹریا کے باشندے ڈاکٹر ہرزل نے گذشتہ صدی کے اواخر میں جنم دیا اور ۱۸۹۷ء میں ایک کانفرنس کی اور ایک کتاب

(Jewish State) کے نام سے لکھی اور اس میں تقریباً سیاست کے متعلق وہی خیالات ظاہر کیے جو بیس سال بعد ہٹلر نے اپنی کتاب میں پیش کیے تھے۔ ہرزل نے جمہوریت بیکار اور غلط چیز بتلائی اور عوام کو حکومت کا نااہل بتلایا اور کہا کہ افراد ہی حکومت کے اہل ہو سکتے ہیں اور ہوتے ہیں، گویا ہرزل ہٹلر کا استاد تھا۔ دنیا کی دوسری بڑی لڑائی کے بعد انگلستان نے فلسطین کے ایک حصہ پر عربوں کی مرضی کے خلاف یہود کو لاکر بٹھا دیا اور ۵۵ فی صد علاقہ فلسطین کا ان کو دیدیا گیا لیکن حالیہ جنگ سے پہلے ہی وہ ۷۷ فی صد علاقہ پر قابض تھے کئی لاکھ عرب باشندوں کو اسرائیل سے زبردستی نکال دیا گیا جو آج برسہا برس سے پہاڑوں اور جنگلوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں اس کے خلاف احتجاج کیا اور اپنا مشہور ریزولیوشن پاس کیا اور اسرائیل کو تنبیہ کی کہ وہ ان عرب باشندوں کو جنہیں گھر سے بے گھر کیا گیا ہے انہیں بسائے لیکن اسرائیل نے اس کی ذرا بھی پرواہ نہ کی اور اقوام متحدہ کے اجلاسوں میں ہر سال یہ تجویز دہرائی گئی لیکن اسرائیل امریکہ اور انگلستان کے سامراجی انتہائی رعونت کے ساتھ ان تجویزوں کو ٹھکراتے رہے۔

اسرائیل کو امریکہ سے دولت کثیر ملتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی مالی حالت اچھی نہیں ہے، اسرائیلی اس کی اہلیت نہیں رکھتے کہ وہ ہندوستان کو کسی قسم کی بھی مدد دے سکیں جیسا کہ منورما دیوان نے اس کتاب میں بتلایا ہے، لیکن ان کے اس غلط پروپیگنڈہ سے ہمارے ملک کا ایک طبقہ متاثر ہے، وہ افراد کو تو رشوتیں دے سکتے ہیں اور دیتے رہتے

ہیں لیکن ہندوستان کو کسی طرح کی بھی تجارتی یا مالی امداد دینے کی ان میں اہلیت نہیں اس کے برخلاف عرب ممالک سے ہماری تجارت اب بھی اچھی خاصی ہے اور اب تو بڑھ کر آئندہ سالوں میں یہ بہت کچھ بڑھ جائے گی۔ عربوں پر یہ الزام کہ اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتے اور اس سے دوستانہ اور ہمسایہ تعلقات کیوں نہیں رکھتے کہاں تک جائز ہے۔ کسی کے گھر میں کوئی باہری شخص زبردستی بٹھا دیا جائے پھر اس سے کہا جائے کہ اس کے ساتھ دوستانہ برتاؤ رکھو یہ کیوں کر ممکن ہے۔ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے جس دن امریکہ اپنی مالی مدد بند کر دے گا جو ظاہر ہے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جاری نہیں رہ سکتی تو اسرائیل بلا عربوں کی مدد کے ایک دن بھی اس ملک میں نہیں ٹھہر سکتے۔ آج بھی ترکی اور ایران مسلم ممالک نے ان کو تسلیم کر لیا ہے ان دونوں ممالک کے ساتھ اسرائیل کی بڑی تجارت جاری ہے لیکن اب ان دونوں ممالک کی ہمدردیاں عربوں کے ساتھ ہو گئی ہیں معلوم نہیں ان ملکوں سے اسرائیل کی تجارت باقی بھی رہے گی یا نہیں۔ اگر عربوں کا اور ایران و ترکی تجارتی لین دین بالکل ہی بند ہو جائے تو بھی اسرائیلی آسانی سے پنپ نہیں سکتے۔

ان تمام باتوں کے علاوہ جن کا تعلق صرف عرب ممالک سے ہے اسرائیل کی طاقت تمام ایشیا کے لئے عموماً اور ہندوستان و پاکستان اور علی الخصوص عربوں کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ وہ سامراج کا ایجنٹ ہے اور اس کے ذریعہ اور اس کی آڑ میں امپیریلزم رفتہ رفتہ اپنا پنجہ افریشین ممالک پر جمانا چاہتا ہے۔ اس یورپی۔ امریکی اسرائیل کا قدم اگر فلسطین میں جم گیا تو رفتہ رفتہ نہ صرف یہ عرب ملکوں پر ہاتھ صاف کرے گا بلکہ اس کا ہاتھ امپیریلزم کی مدد سے برصغیر ہند و پاک تک بھی پہونچ سکتا ہے۔

تاریخ کے آئینے میں

اونٹ اور عرب کی کہانی تو آپ نے سُنی ہی ہوگی۔ بس یہی سمجھ لیجئے کہ فلسطین کے بدنصیب عربوں ہی کے بارے میں یہ کہانی لکھی گئی تھی۔ اس میں خیمہ کو آپ فلسطین کا نام دے سکتے ہیں اور اونٹ کی جگہ وہ یہودی آباد کار لے سکتے ہیں جو اس صدی کے شروع میں فلسطین کی سرزمین پر پہنچے۔ عربوں کے ساتھ انہوں نے جو کچھ کیا اس کا سب سے تازہ اظہار وہ حملہ ہے جس نے چنگیز و ہلاکو، ہٹلر اور مسولینی کے جارحانہ حملوں کو بھی اپنی بربریت اور وحشیانہ طریقوں میں مات کر دیا پانچ دن کے اندر اندر اسرائیل اپنے سے ساڑھے تین گنا زیادہ رقبے پر قابض ہو گیا، اسی دوران میں ساٹھ ہزار عرب سپاہی اپنے وطن کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہوتے۔ لاکھوں بے قصور لوگ خانماں برباد ہو گئے۔ عرب فوجی طاقت کافی مدت کے لئے تباہ ہو کر رہ گئی، ہزاروں سہاگنوں کا سہاگ اجڑ گیا۔ لاکھوں بچے یتیم ہو گئے، بیت المقدس، یروشلم اور کوہِ طور کی سرزمین صحرائے سینا پر یہودی جارحیت کے ٹینک دندنانے لگے اور پورے ایشیا اور افریقہ کی آزادی کے لئے اس دور کا

سب سے بڑا خطرہ نمودار ہو گیا۔

یہ ہے اس معصوم سے اونٹ کا "کارنامہ" جو پہلی بار اس صدی کے شروع میں فلسطین کی سرزمین پر نمودار ہوا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک جو کچھ ہوا ہے وہ مکاری، دھوکہ دہی، سازش، فریب، جارحیت اور سینہ زوری کی وہ داستان ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں اور کہیں نہیں ملتی۔

یہ سب کچھ کیسے ہوا، اسے سمجھنے کے لئے آئیے اس کہانی کو شروع ہی سے شروع کریں۔

بحیرۂ ایٹلانٹک سے لے کر بحیرۂ عرب تک عرب دنیا پھیلی ہوئی ہے فلسطین ہمیشہ سے اسی عرب دنیا کا ایک اہم حصہ رہا ہے۔ فلسطین کے باسی عام طور پر عرب دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے لکھے، باشعور اور باہمت لوگ سمجھے جاتے ہیں، پرانے وقتوں سے لے کر آج تک فلسطین کی پوتر دھرتی دنیا کے تین بڑے مذہبوں عیسائیت، اسلام اور یہودیت کے لئے متبرک اور مقدس رہی ہے۔

تاریخی زمانے کے آغاز کے وقت فلسطین پر کنعانیوں کا قبضہ تھا یہ لوگ جزیرۃ العرب سے آکر یہاں آباد ہوئے تھے۔ جغرافیائی طور پر فلسطین کو مغربی ایشیا کے ایک چوراہے کی حیثیت حاصل تھی، شاید اسی لئے یہاں پر ہندوستان ہی کی طرح کئی طرفوں سے آنے والے حملہ آوروں کا تانتا بندھا رہا۔ ان میں کنعانی، فنیشانی، عبرانی، یونانی، رومی، ایرانی، صلیبی جنگوں کے دوران آنے والے

یوربین اور اس صدی کے شروع تک فلسطین پر راج کرنے والے عثمانی ترک بھی شامل تھے۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ اتنے زیادہ فاتحوں کے باوجود فلسطین کا عرب کردار سو فی صدی حد تک قائم رہا، زمین پر عربوں ہی کا قبضہ رہا اور ۹۵ فیصدی آبادی بھی عربوں ہی کی رہی۔ تجارت، علمی لین دین، سماجی تعلقات اور مذہب کے سلسلے میں بھی فلسطین کے باشندے عرب دنیا کے دوسرے حصوں سے پوری طرح جڑے رہے۔

یہی وہ حقائق تھے جن کی بنا پر موجودہ وقت کے سب سے اہم مورخ پروفیسر آرنلڈ ٹائین بی نے اپنی مشہور کتاب "عالمی تاریخ کا مطالعہ" میں لکھا ہے کہ "مجھے اپنے اُن ہم وطن انگریزوں کی سمجھ پر ہنسی آتی ہے جو فلسطین پر یہودیوں کا کوئی بھی حق تسلیم کرتے ہیں، ۱۸ سو سال بعد یہودی اب یہ کہنے لگے ہیں کہ یہ سرزمین ان کی تھی کیونکہ اُن کے بزرگوں نے وہاں پر کبھی ستر سال تک حکومت کی تھی۔ اگر ان کا یہ دعویٰ مان لیا جائے تو پھر امریکہ پر وہاں کے موجودہ باسیوں کا کوئی حق تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ نہ ہی انگلستان یہ انکار کر سکتا ہے کہ اس پر اب بھی رومنوں کا قبضہ نہیں ہونا چاہئے، سچ تو یہ ہے کہ یہودیوں کا دعویٰ ہے ہی سراسر غلط، آج کی دنیا میں اتنے پرانے نسلی اور مذہبی دعووں کو مان لینا ایک بہت بڑے خطرے کو دعوت دینے کے برابر ہے۔"

صیہونی سایہ

فلسطین کی حالیہ تاریخ اس صدی کے آغاز سے شروع ہوتی ہے۔ اس وقت یورپ کے کچھ یہودیوں نے آسٹریا کے ایک یہودی جرنلسٹ ہرزل کی رہنمائی میں یہ فیصلہ کیا تھا کہ ارضِ مقدس میں کچھ یورپین یہودی جاکر آباد ہوں یہ فیصلہ صرف اسی لئے نہیں کیا گیا تھا کہ فلسطین کی دھرتی سے یہودیوں کو کچھ ایسا ہی مذہبی لگاؤ رہا ہے جیسا کہ ہندوستان کے کچھ بودھ دھارمک استھانوں یعنی سارناتھ اور گیا سے دنیا بھر کے بودھوں کو ہے۔ فلسطین میں بستیاں بسانے میں یہودیوں کو سب سے بڑی آسانی یہ بھی تھی کہ دنیا میں اور خاص طور پر یورپ میں کوئی بھی ملک یہودیوں کو منہ لگانے کے لئے تیار نہیں تھا، مگر عرب دنیا میں یہودی ہمیشہ سے امن وامان کی زندگی بسر کرتے رہے تھے۔ اسی لئے یہودیوں نے جب سوئزرلینڈ کے شہر باسلے میں اپنی پہلی صیہونی کانگریس (۲۷ اگست ۱۸۹۷ء) منعقد کی تو ان کی نظر فلسطین ہی پر پڑی، یہاں پر عرب آبادی کی فراخدلی کے باعث انہیں امید تھی کہ ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئے گی۔

صیہونی کانگریس کا بظاہر مقصد صرف یہ بتایا گیا کہ دنیا کے سب یہودی مل کر دنیا کے کسی حصے میں ایک ایسی ریاست بنانے کی کوشش کریں جہاں پر یہودی دھرم کے احکام کے مطابق حکومت کا کام چلایا جائے، اس مقصد کے لئے کئی علاقوں پر نگاہ پڑی، مثال کے طور پر جزیرۂ قبرص میں ایک یہودی ریاست

قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا مگر یونانیوں کی زبردست مخالفت کے باعث اسے ترک کر دیا گیا۔ پھر تجویز ہوئی کہ مشرقی افریقہ یعنی کینیا میں یہودی حکومت قائم کر دی جائے، ہرزل نے یہ تجویز مان بھی لی مگر پھر برطانوی حکومت اور بارسوخ یہودیوں نے اسے کئی اور مصلحتوں کی بنا پر رد کر دیا۔ ایک بار سینائی کے صحرا میں وادیِ العریش کے آس پاس بھی ایسی حکومت بنانے کا خیال آیا مگر مصری حکومت نے اسے فوراً رد کر دیا۔ یہ محض اتفاق ہی نہیں تھا کہ ایشیا کی دھرتی پر یورپین یہودیوں کی ایک کالونی بنانے کے خیال نے اسی وقت جنم لیا جبکہ یورپین سامراج اور خاص طور پر برطانوی امپیریلزم مشرق میں اپنی نوآبادیوں کی حفاظت کے لئے سرتوڑ کوشش کر رہا تھا۔

برطانیہ کے بدنام ترین سامراجی وزیراعظم ڈاسرائیلی نے جو کہ خود یہودی نژاد تھا اپنی سرکاری ڈائری میں لکھا ہے کہ ہندوستان کی حفاظت مصر میں مورچہ بنائے بغیر نہیں کی جا سکتی " ڈاسرائیلی نے یہ بھانپ لیا تھا کہ برطانوی سامراج کی حفاظت ہی کے لئے ضروری ہے کہ عرب دنیا پر برطانوی تسلط قائم کیا جائے نہر سویز کے کھلنے کے کارن فلسطین اور اس کے آس پاس کے علاقے کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ گئی تھی، عین اسی لئے انگریزی حکومت نے دل کھول کر صیہونی ارادوں کی حوصلہ افزائی کی۔ بارسوخ برطانوی سرمایہ داروں نے اپنے بنکوں کے دہانے یہودی آبادکاروں کے لئے کھول دیئے تاکہ وہ اس روپے کی مدد سے

فلسطین میں زرعی زمینیں خرید کر اپنی نو آبادیاں قائم کر لیں ۔ اسی دوران یہودیوں نے سلطان ترکی کو کافی روپے کی مدد سے بہلانے اور ورغلانے کی کوشش کی کہ وہ فلسطین کا ایک بڑا حصہ ان کی تحویل میں دے دے سلطان نے یہ بات تو نہ مانی لیکن کچھ یہودی روپے سے مرعوب ہو کر اور کچھ اپنی سادگی اور فراخدلی کی بدولت اس نے چند خاص علاقوں میں یہودیوں کو آباد ہونے کی اجازت دے دی پہلی جنگ عظیم کے شروع تک روس، پولینڈ اور آسٹریا وغیرہ سے آنے والے یہودی آباد کاروں نے فلسطین کے کچھ علاقوں میں اپنی بستیاں قائم کر لی تھیں، لیکن اس کے باوجود دوسری جنگ عظیم تک یہودی ۲ فی صدی سے زیادہ زرعی رقبے پر قابض نہیں تھے، آبادی کے لحاظ سے بھی فلسطین کی سات لاکھ آبادی میں سے ان کی تعداد پچاس ہزار سے کم تھی، ان ۵۰ ہزار یہودیوں میں سے بھی اکثریت ایسے یہودیوں کی تھی جو صدیوں سے فلسطین میں آباد تھے اور جنہیں عرب مصنف عام طور پر "عرب یہودیوں" کا نام دیتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء تک فلسطین میں ایک یہودی ریاست بنانے کا خواب لینے والوں کی کل تعداد دو یا تین فی صدی سے زیادہ نہیں تھی ۔ ان دو تین صدی لوگوں میں سے بھی چند گنے چنے یہودی لیڈروں کے علاوہ کسی کو خیال نہیں تھا کہ فلسطین میں ان کی حکومت قائم ہو جائے گی، مگر پہلی جنگ عظیم نے سامراجی خوابوں کو پورا کرنے کا ایک عظیم موقعہ فراہم کر دیا۔

بندر بانٹ

پہلی جنگ عظیم کے دوران انگریزوں نے کئی طرح کے حربوں اور رسوائے زمانہ جاسوس کرنل ٹی ای لارنس کی مدد سے عربوں کو ترکوں کے خلاف اپنے ساتھ ملا لیا۔ فلسطین، شام اور عرب دنیا کے کئی اور علاقوں کو پہلے باغی عربوں ہی نے فتح کیا تھا اتحادیوں نے نہیں۔ مگر عین اس وقت عرب عثمانی ترکوں سے فلسطین اور دوسرے عرب علاقے اس امید میں خالی کروا رہے تھے کہ اس طرح وہاں پر ان کا اپنا راج قائم ہو جائے گا، انگریز سامراجی تاریخ کی سب سے گھناؤنی سازش میں مصروف تھے۔

فلسطین پر اتحادی قبضے کے بعد عربوں سے دو طرح کی غداری کی گئی۔ پہلی تو یہ کہ عرب ملکوں کو وعدے کے مطابق آزاد کرنے کے بجائے انہیں برطانیہ اور فرانس نے "امانتی علاقوں" کے طور پر آپس میں بانٹ لیا۔ اس بندر بانٹ میں فلسطین اور عراق انگریزوں کے قبضے میں آئے اور شام اور لبنان فرانسیسیوں کے تسلط میں اس سے بھی زیادہ شرمناک حرکت یہ کی گئی کہ ۲ر نومبر ۱۹۱۷ء کو برطانیہ کے وزیر خارجہ لارڈ بیلفور نے یہودیوں کی عالمی تحریک کے رہنما اور انگلستان کے سب سے بڑے بینکر لارڈ روتھ شائیلڈ (Rothschild) کو ایک سرکاری خط لکھا جس میں کہا گیا "مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے صیہونی تحریک کے لئے ہمدردی اور حمایت کا اعلان کرتے ہوئے بے حد خوشی محسوس ہو رہی ہے،

"آپ یہ جان کر خوش ہوں گے کہ ملکِ معظم کی حکومت فلسطین میں یہودی لوگوں کے لئے ایک قومی گھر بنانے کی تجویز کا خیر مقدم کرتی ہے اور یقین دلاتی ہے کہ وہ اس مقصد کو پورا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گی، یہ امر واضح رہے کہ اس پالیسی سے مقامی آبادی کے حقوق پر یا دوسرے ملکوں میں آباد یہودیوں کے حقوق پر کسی قسم کا حرف نہیں آئے گا، میں شکر گذار ہوں گا کہ آپ اگر اس اعلان کو صیہونی فیڈریشن کے عہدیداروں تک پہونچادیں۔

اس اعلان کو عام طور پر بیلفور اعلان کا نام دیا جاتا ہے، حالیہ تنازعہ کی جڑ یہی اعلان کہا جا سکتا ہے فلسطین میں عربوں کا المیہ یہیں سے شروع ہوتا ہے اس کے بعد کے فلسطین کی تاریخ میں ہمیں انگریزی سامراج کی مکاریوں، شاطرانہ چالوں اور عربوں پر ظلم و جبر کے سوائے اور کچھ نہیں ملتا، پنڈت نہرو نے ۱۹۳۷ء میں موڈرن ریویو میں شائع شدہ ایک مضمون کے دوران بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ "بیلفور اعلان عربوں کے ساتھ برطانیہ کی غداری کی سب سے بڑی مثال تھی۔"

امانت میں خیانت

فلسطین پر برطانوی قبضے کی حیثیت انتداب (**Mandate**) یعنی امانت کی تھی، لیگ آف نیشنز نے اس وقت تک یہ قبضہ برطانیہ کو دیا تھا جب تک کہ مقامی آبادی خود راج کرنے کے قابل نہ ہو جائے۔

فلسطین میں برطانوی راج کی پالیسی کیا تھی اس کا سب سے واضح ثبوت ہمیں لارڈ بیلفور کی سرکاری ڈائری میں سے لئے گئے اس اقتباس سے ملتا ہے جو برطانوی خارجہ پالیسی کے مسودات (شائع شدہ ۱۹۳۲ء) کی جلد دوم میں اب تک موجود ہے ۱۹ راکتوبر ۱۹۱۸ء کو بیلفور نے اپنی ڈائری میں لکھا: "فلسطین میں ہم مقامی آبادی کی رائے معلوم کرنے یا ان سے مشورہ لینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں سمجھتے ہمارے لئے صیہونی تحریک اُن سات لاکھ عربوں سے کہیں زیادہ اہم ہے جو اس قدیم سرزمین پر صدیوں سے آباد ہیں۔" آگے چل کر بیلفور نے مکمل ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ لکھا ہے کہ فلسطین میں اتحادیوں نے کبھی کوئی ایسا اعلان نہیں کیا جو حقیقت پر مبنی ہو یا جسے وہ بعد میں توڑنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔"

فلسطین پر انگریزی قبضے کے شروع سے یہ واضح ہو گیا کہ حکومت کی پالیسی ہے کہ وہاں پر جلدی سے جلدی ایک یہودی مملکت قائم کر دی جائے۔ مثال کے طور پر ایسے کئی قاعدے اور قانون لاگو کر دیئے گئے جن کی بنا پر عرب عوام حکومتی یا سرکاری عہدوں پر فائز نہیں ہو سکتے تھے تمام اعلیٰ انتظامی آسامیوں پر انگریز اور یہودی تعینات کر دیئے گئے، شروع کے سالوں میں تو ہائی کمشنر بھی صیہونی ارادوں میں گہرا یقین رکھنے والا یہودی ہی تھا۔ مالیہ، غیر ملکی سفیر، قومیت اور غیر ملکی آبادکاروں سے متعلق محکموں کے ڈائرکٹر عام طور پر انگریز یہودی ہی مقرر کئے جاتے۔

برطانیہ کی یہودی نواز پالیسی کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ زیادہ سے زیادہ

یورپین یہودیوں کی ہر طرح سے حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ فلسطین میں آکر آباد ہوں، یہودی آبادکاری سے متعلق اداروں نے اس بات کا بھی دھیان رکھا کہ جو لوگ بھی آئیں ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہو جو فوج یا پولیس میں پہلے کام کر چکے ہوں جن لوگوں کو ایسے کام کا تجربہ نہیں تھا انہیں آبادکاری سے پہلے خاص طور پر فوجی ٹریننگ دی گئی - انگریز سرکار نے ایسے قانون لاگو کئے جن کی بدولت عربوں سے زمینیں چھنتی گئیں اور یہودیوں کو ملتی گئیں، عرب کاشتکاروں پر مالیہ کی شرح کل پیداوار کے ۳۵ فی صدی حصے تک بڑھادی گئی جو کہ عثمانیوں کے زمانے کے مقابلہ میں ڈھائی گنا سے زیادہ تھی، اتنا زیادہ مالیہ نہ دینے کے بہانے عربوں کی کافی بڑی اراضیاں سرکاری طور پر نیلام کردی گئیں، ۱۹۳۴ء تک عرب املاک پر ٹیکسوں کی شرح ۱۹۱۸ء کے مقابلہ میں چار گنا سے بھی زیادہ ہوچکی تھی، اس کے مقابلہ میں نوآبادکار یورپین اور امریکی یہودیوں کو اراضی کے کافی بڑے رقبے یا تو بالکل مفت دیدیئے گئے اور یا برائے نام کرایہ پر، عرب کاشتکاروں کو تباہ کرنے کے لئے ان تمام چیزوں پر درآمدی اور برآمدی ٹیکس بڑھا دیئے گئے، جو عرب باہر کے ملکوں کو بیچتے یا خریدتے تھے، مگر اس کے ساتھ ہی یہودیوں کی کھلے بندوں حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ اپنا سامان قانونی طور پر "اسمگل" کرکے ٹیکسوں کی ادائیگی سے بچ جائیں قانون کے مطابق ہی انہیں کافی سامان اپنی ضروریات کے لئے بلا ٹیکس لانے کی اجازت دی گئی -

برطانوی سرکار نے عربوں کو مناہی کردی کہ وہ کسی قسم کے ہتھیار یا اسلحہ نہیں رکھ سکتے، اس بات کی مثالیں موجود ہیں کہ کئی عربوں کو صرف معمولی سا اسلحہ رکھنے کے جرم میں موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، عربوں نے جب بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی اور کسی قسم کا کوئی احتجاج کیا تو ان کے خلاف جبر و تشدد کے بدترین مظالم توڑے گئے، ایک محتاط اندازہ کے مطابق ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۴۷ء تک برطانوی فوجیں دس ہزار سے زائد عربوں کو مختلف بہانوں سے موت کے گھاٹ اتار چکی ہیں اور ۱۴۷ عرب دلیش بھگتوں کو باقاعدہ پھانسی پر لٹکا چکی تھیں۔

دوسری طرف اس بات کی پوری حوصلہ افزائی کی گئی کہ یہودی پوری طرح سے مسلح ہوتے جائیں، انگریزوں نے یہودیوں کو کھیلوں کے اکھاڑوں اور اسکاوٹ گروپوں کی آڑ میں عربوں کے خلاف دہشت پھیلانے والی تنظیمیں بنانے کی پوری طرح سے اجازت دی، یہی نہیں بلکہ یہودیوں کو اس بات کی اجازت بھی مل گئی کہ وہ خود حفاظتی تدبیروں کے نام پر ایک نیم فوجی قسم کی تنظیم یہودی حفاظتی دستہ کے نام سے بنالیں، ان لوگوں نے کبھی اکیلے اور کبھی برطانوی پولیس اور فوج کے عملے سے ملکر کئی بار عرب علاقوں میں قتل اور خون کا بازار گرم کیا، بیسیوں عرب گاؤں ملیا میٹ کر دیئے گئے اور جافہ، حیفہ اور جنین جیسے کئی اہم شہروں سے ہزاروں عربوں کا صفایا کر دیا گیا، عربوں نے جب بھی کوئی جوابی کارروائی کی تو ان کے خلاف برطانوی حکومت نے سخت ترین اقدامات کئے ان اقدامات میں عرب دیہات اور

قصبات پر بھاری تعزیری جرمانے، سیکڑوں کی تعداد میں عربوں کی گرفتاریاں اور عرب قومی جماعتوں کا خلاف قانون قرار دینا بھی شامل تھا۔

ان حقائق سے اس سوال کا کچھ حد تک جواب مل گیا ہوگا جو اکثر ناواقف لوگ پوچھتے رہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ آخر کس طرح ۳۰ سال سے بھی کم عرصے میں تین فی صدی سے بھی کم تعداد میں یہودی فلسطین کے تین چوتھائی سے بھی زیادہ بڑے حصے پر قبضہ جمانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سوال کا کچھ جواب دیا جا چکا ہے مگر اس کے ساتھ ہی یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ شروع ہی سے فلسطین میں آباد یہودیوں کو امریکہ، برطانیہ، ہالینڈ، بلجیم، فرانس اور دوسرے مغربی ملکوں کے صیہونی اداروں نے بھاری امداد دی۔ ۱۹۴۸ء تک اس کی سالانہ اوسط دو کروڑ ڈالر سے بھی زیادہ ہے۔ اسرائیل کے ایک "جنم داتا" بنگورین نے اپنی خود نوشت سوانح عمری میں اتنی بڑی رقم کے ملنے کا اعتراف کیا، اس رقم کے ذریعہ نہ صرف فلسطین میں آباد یہودیوں کو ہر طرح کے اسلحہ اور ہتھیار پہنچائے گئے بلکہ مقامی آبادی کو بھی مرعوب کرنے کے لئے بیسیوں طرح کے اقدامات کئے گئے اسی رقم کے ذریعہ حکام کو بھاری رشوتیں دی گئیں اور ساری دنیا میں جاسوسی اور پراپیگنڈے کے ایسے ادارے قائم کئے گئے جو اپنے "فنون" کی تاریخ میں اپنا جواب نہیں رکھتے، ان سب ہی حرکتوں اور پالیسیوں کا اثر یہ ہوا کہ ۱۹۴۷ء تک یہودی آبادی کا تناسب کل آبادی کے مقابلہ میں تقریباً ۳۲ فی صدی ہو گیا، ان کے زیر کاشت آراضی کا تناسب بھی

جو ۱۹۱۸ء میں صرف دو فی صدی تھا بڑھ کر چھ فی صدی ہو گیا، حیرت اس بات پر ہے کہ اپنے روپے اپنی اعلیٰ تنظیم اور برطانوی سرکار کی کھلم کھلا حوصلہ افزائی کے باوجود صیہونی تحریک ۱۹۴۸ء تک صرف ساڑھے چھ لاکھ یہودیوں کو فلسطین کے چھ فی صدی رقبے پر آباد کر سکی، اس کے مقابلہ میں عربوں کی تعداد چودہ لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ یہ بھی یاد رہے جہاں عربوں کی آبادی قدرتی طریقے سے بڑھی وہاں ساڑھے چھ لاکھ یہودیوں میں سے ساڑھے پانچ لاکھ سے زیادہ یورپین اور امریکی آباد کار تھے۔

سازش کی کڑیاں

دوسری جنگِ عظیم کے دوران صیہونی لیڈروں کو اس ہمدردی سے فائدہ اٹھانے کا خاص طور پر موقع ملا جو دنیا بھر کے جمہوریت پسند عوام کو ہٹلر کے ستائے ہوئے یہودیوں سے تھی، اسی دوران دہشت پسند یہودی تنظیموں نے فلسطین میں یہودی راج قائم کرنے کے لئے اپنی تیاریاں تیز کر دیں، یہودی دہشت پسند جماعت ہگانا، (Haganah) کو اسی دوران ایک باقاعدہ فوج کی شکل میں قائم کیا گیا، ہٹلر کے خلاف جنگی تیاریوں کے نام پر یہودیوں نے کافی مقدار میں اسلحہ اور ہتھیار بھی اکٹھے کر لئے، ان کے مقابلے میں عرب خاصے بے بس ثابت ہوئے، ان کے اکثر ملک یا تو جنگ کا میدان بن چکے تھے اور یا مغربی سامراج کے براہِ راست چنگل میں پھنس چکے تھے۔

اسی دوران مغربی ملکوں کے یہودیوں نے بھی فلسطین میں اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے اپنی سرگرمیوں کو تیز کر دیا۔ ان سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز امریکہ تھا، امریکہ میں یہودی آبادی تو زیادہ نہیں ہے لیکن امریکی سرمائے، امریکی اخباروں ریڈیو اور ٹیلی ویژن کمپنیوں اور زندگی کے دوسرے اہم شعبوں پر یہودی بری طرح سے چھائے ہوئے ہیں، ۱۱ رمئی ۱۹۴۲ء کو نیویارک میں صیہونی تحریک کی عالمی کانگریس میں یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب سے صیہونی تحریک کا ایک ہی مقصد ہوگا اور وہ یہ کہ فلسطین سے عرب باشندوں کو نکال کر وہاں پر یہودی راج قائم کر دیا جائے۔ امریکہ میں یہودی دباؤ اس قدر مضبوط ثابت ہوا کہ اس کے فوراً بعد امریکہ کی صدارتی چناؤ مہم میں دونوں امیدواروں یعنی روزویلٹ اور ڈیوی نے اس مقصد کو اپنے انتخابی پروگرام کی ایک اہم مد بنا لیا، ۱۹۴۴ء میں امریکی کانگریس کے دونوں ایوانوں نے یہ اعلان کر دیا کہ "امریکہ چاہتا ہے کہ فلسطین کے دروازے یہودی آبادکاروں کے لئے بلا روک ٹوک کھول دیئے جائیں تاکہ بالآخر وہاں پر ایک آزاد اور جمہوری یہودی ریاست قائم کر دی جائے۔"

حق انصاف اور جمہوریت کے ان علمبرداروں نے یہ جاننے کے لئے رتی بھر کوشش نہیں کی کہ اس طرح دو تہائی مقامی عرب آبادی کے حقوق پر کیا اثر پڑے گا۔ یہی وجہ تھی جنگ کے خاتمے تک عربوں کو پتہ چلا کہ دنیا کی تین بڑی طاقتیں یعنی برطانیہ اور امریکہ کی سرکاریں اور عالمی صیہونی تحریک ان کے ملک سے ان کا

وجود ختم کرنے کے لئے پوری طرح سے متحد، آمادہ اور تیار ہو چکی ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلا قدم ۱۹۴۶ء میں اٹھایا گیا جبکہ انگریزوں اور امریکیوں نے مسئلے پر غور کرنے کے لئے ایک ملا جلا کمیشن فلسطین بھیجا، اس کمیشن نے سفارش کی کہ یہودی نوآبادکاروں پر فلسطین کے دروازے غیر مشروط طور پر کھول دیئے جائیں اور ایک لاکھ یہودیوں کو فلسطین میں داخل ہونے کی فوراً سہولت بہم پہنچائی جائے تاکہ صدر ٹرومین کا وہ مطالبہ پورا ہو سکے جو اس نے اگست ۱۹۴۵ء میں برطانوی سرکار سے کیا تھا، ۱۹۴۶ء کے آخر میں برطانیہ نے فلسطین سے متعلق مختلف لوگوں کی ایک کانفرنس بلائی۔ اس کانفرنس میں عربوں نے جو تجویز بھی پیش کی اسے کسی غور کے بغیر رد کر دیا گیا، ایسی صورت میں کانفرنس کی ناکامی متوقع ہی تھی اب برطانیہ نے ایک اور ترپ چال چلی، برطانیہ سرکار کو احساس تھا کہ اس وقت اقوام متحدہ پر مغربی سامراج کا غلبہ اتنا مضبوط ہے کہ امریکہ اور برطانیہ جو تجویز بھی پیش کریں گے اس کی منظوری مشکل نہیں ہوگی، عین اسی خیال سے برطانیہ نے ۱۹۴۷ء کے شروع میں اس مسئلہ کو یو این او کے سامنے پیش کر دیا۔

برطانیہ کے ایما پر مئی ۱۹۴۷ء میں اقوام متحدہ کی عام اسمبلی کا ایک خاص اجلاس بلایا گیا، اس اجلاس نے گیارہ ملکوں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن، فلسطین بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس کمیشن کے آٹھ ممبروں نے جن میں ایک کے سوائے سب ہی یورپین اور امریکی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے فلسطین کی دو حصوں

میں تقسیم کی سفارش کی، بڑا حصہ یعنی تقریباً ۵۵ فی صدی رقبہ یہودیوں کو دیا گیا حالانکہ یہودی آبادی ایک تہائی تھی اور وہ صرف چھ فی صدی رقبے پر قابض تھے چھوٹا حصہ یعنی تقریباً ۴۵ فی صدی رقبہ عرب ریاست کے لئے رکھا گیا جن کی آبادی اس وقت بھی دو تہائی سے زیادہ تھی، یروشلم کے بارے میں سفارش کی گئی کہ اسے عالمی نگرانی میں ایک علیحدہ غیر جانبدار زون بنا دیا جائے۔

اس کمیشن میں ہندوستان بھی شامل تھا، ہندوستان نے کمیشن کے دو دوسرے ممبروں ایران اور یوگوسلاویہ کے ساتھ مل کر سفارش کی کہ فلسطین کو تقسیم کرنے کے بجائے ایک وفاقی ریاست بنا دیا جائے، مگر بڑی طاقتوں کی سیاسی مصلحتوں کے سامنے ہندوستان جیسے ملکوں کی کوشش بری طرح ناکام ثابت ہوئیں، بڑی طاقتوں نے اس طرح اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا اس کا سب سے شرمناک اعتراف خود صدر ٹرومین نے اپنی ڈائری میں یہ کہہ کر کیا ہے کہ "ظاہر ہے کہ مجھے یہودیوں ہی کی حمایت کرنا تھی کیونکہ امریکہ میں عرب نہیں بستے"۔ اسرائیل کے پہلے صدر اور عالمی صیہونی تحریک کے بہت بڑے لیڈر وائزمین نے اسی سلسلہ میں اپنی خود نوشت سوانح حیات میں یہ کہہ کر سامراجی سازشوں کی قلعی کھول دی ہے کہ فلسطین کی تقسیم کا ریزولیوشن عام اسمبلی میں کبھی پاس نہ ہوتا اگر ٹرومین اس کے ایما پر کئی ڈیلی گیٹوں پر زبردست ذاتی اثر نہ ڈالتا۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اتنے زیادہ اثر و رسوخ کے باوجود مختلف

بہانوں پر تین بار عام اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا گیا، امریکہ کے ایک سابق نائب وزیر خارجہ فوراسٹال نے اعتراف کیا ہے کہ یہ اجلاس صرف اس لئے ملتوی کئے گئے کہ عام اسمبلی میں فلسطین کی تقسیم کے لئے فضا ہموار کی جا سکے، بد قسمتی سے خاص قسم کی مصلحتوں کے باعث اسٹالنی دور کا روس بھی تقسیم کی حمایت میں صف آرا ہو گیا۔

عربوں نے ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ملکوں کی مدد سے پوری کوشش کی کہ حق وانصاف کے تقاضے عالمی اسمبلی کے فیصلوں پر اثر انداز ہوں لیکن بڑی طاقتوں کی شاطرانہ چالوں نے ان کی پیش نہ چلنے دی، عربوں نے ہندوستان کی تجویز کی مکمل حمایت کی کہ فلسطین کو ایک وفاقی ریاست بنا دیا جائے جہاں بسنے والے یہودیوں کو مکمل اندرونی آزادی حاصل ہو۔ جب یہ نہیں مانا گیا تو انہوں نے فلسطین میں رائے شماری کی تجویز پیش کی، آخر میں عربوں نے یہ کہا کہ اس مسئلے پر عالمی عدالت ہی کی رائے لے لی جائے کہ فلسطین کی تقسیم جائز ہے یا ناجائز لیکن عام اسمبلی میں ان تجویزوں پر کسی نے معمولی غور تک کرنا ضروری نہ سمجھا۔

آخر کار ۲۹ نومبر ۱۹۴۷ء کو فلسطین کی تقسیم کا ریزولیوشن پاس کر دیا گیا، ایشیا اور افریقہ کے تمام ملکوں (ماسوائے فلپائن، ترکی اور اتھوپیا کے) اس ریزولیوشن کی مخالفت کی، ریزولیوشن کے مطابق عرب ریاست کو ۴۲،۸۸ فی صدی علاقہ اور یہودی ریاست کو ۵۶،۴۷ فی صدی علاقہ دیا گیا، یاد رہے کہ فلسطین کا کل رقبہ دس ہزار مربعہ میل کے قریب تھا اس میں سے ۲۰۰ مربعہ میل رقبہ کو یروشلم کا "کھلا عالمی شہر"

بنانے کی سفارش کی گئی، ظاہر ہے کہ اس ریزولیوشن نے حق اور انصاف کے تمام تقاضوں کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں کیونکہ اس سے صاف ظاہر تھا کہ ایک تہائی یہودی آبادی کو دو تہائی عرب آبادی کے مقابلہ میں ہر طرح سے ترجیح دی گئی ہے۔ انہی دنوں برطانیہ نے یہ اعلان کر دیا کہ وہ ۱۵ رمئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین سے اپنا قبضہ ہٹانا شروع کرے گا یہ بھی کہا گیا کہ انخلاء کا یہ پروگرام اگست ۱۹۴۸ء میں ختم ہوگا جبکہ برطانوی فوجیں حیفہ کی بندرگاہ کو خالی کر کے واپس چلی جائیں گی، اس کے ساتھ ہی یہ یقین دہانی کروائی گئی کہ برطانیہ سب ہی باشندوں کے جان و مال کی حفاظت کرتا رہے گا۔

اسرائیل کا قیام

اگلے کچھ ہی دنوں میں یہودی دہشت پسندوں نے اس اعلان کی دھجیاں اڑا کر رکھ دیں، انہوں نے فوراً ایسی کارروائیاں شروع کر دیں، جن سے گھبرا کر نہتے عرب باشندوں نے بھاگنا شروع کر دیا، ان کارروائیوں میں سب سے خوفناک حملہ یروشلم کے قریب ایک عرب گاؤں دیریاسین پر کیا گیا جہاں سیکڑوں عرب باشندے بوڑھوں، بچوں اور عورتوں سمیت یا تو قتل کر دیئے گئے یا اپاہج بنا کر باہر نکال دیئے گئے، اسی قسم کی وحشیانہ کارروائیاں حیفہ، جافہ اور ایسے تمام علاقوں میں کی گئیں جنہیں یہودی اپنے لئے اہم سمجھتے تھے، برطانیہ حکومت نے ان کارروائیوں کی روک تھام کرنے کے بجائے یہودی دہشت پسندوں کی پوری طرح سے حوصلہ افزائی کی، سب سے بڑی غداری یہ کی گئی کہ ۱۵ رمئی ہی کو برطانیہ نے سارا

فلسطین خالی کرنے کا اعلان کر دیا، اس وقت تک یہودی دہشت پسند لیبے کئی علاقوں پر قابض ہو چکے تھے، جو یو این او کے ریزولیوشن کے مطابق یہودی ریاست کی حدود سے باہر تھے، برطانیہ نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت اپنے وعدے سے بہت پہلے فلسطین خالی کرنے کا جو اقدام کیا تھا، یہودیوں نے اس سے مکمل فائدہ اٹھایا اور ۱۵ر مئی ۱۹۴۸ء کو فلسطین میں اسرائیل کے نام سے ایک آزاد یہودی ریاست کے قیام کا اعلان کر دیا، یاد رہے کہ یہ مسئلہ اس وقت بھی اقوام متحدہ کے درپیش تھا اور قانونی طور پر یہ اعلان کر کے صیہونیوں نے عالمی قانون کو اپنے ہاتھ میں لے کر خود اقوام متحدہ کی طاقت اور اختیار کا مذاق اڑانے کی کامیاب کوشش کی تھی مگر بڑی طاقتوں پر ان کے چھینٹے پٹھوؤں کی اس حرکت سے بھی جوں تک نہیں رینگی۔

اسرائیل کے قیام کے اعلان کے ساتھ ہی امریکہ نے سب سے پہلے اور اس کے فوراً بعد دوسری بڑی طاقتوں نے اسرائیل تسلیم کر لیا، اسی دوران اسرائیلیوں نے مقامی عرب باشندوں کے خلاف اپنے حملے تیز کر دیئے، لاکھوں عرب ان حملوں کی بدولت بے گھر بنا دیئے گئے، عرب ملکوں نے عرب لیگ کے ذریعہ اقوام متحدہ پر زور دیا کہ وہ اسرائیل کو ان جارحانہ کارروائیوں سے باز رکھنے کی کوشش کرے لیکن امن اور انصاف کے پرستاروں نے یہ بات سنی کی ان سنی کر دی، آخر کار تنگ آ کر اور مایوس ہو کر عرب ملکوں نے فلسطین کے عرب عوام کی مدد اور حفاظت

کے لئے فوجی کارروائی شروع کردی۔ اس کارروائی کے شروع ہوتے ہی اقوام متحدہ میں امنِ عالم کے خود ساختہ پرستار فوراً حرکت میں آگئے، اس دخل اندازی کا مطلب صرف یہ تھا کہ اسرائیل کو ذرا قدم جمانے کا موقعہ مل جائے کیونکہ اس بات کا پورا خطرہ تھا کہ اپنے پہلے حملے میں عرب ملک اسے ختم کردیں گے، سکیورٹی کونسل نے فوراً ہی جنگ بندی کا حکم دیدیا اور سوئیڈن کے شہزادہ کاؤنٹ برناڈوٹ کو امن کا نگراں بناکر بھیجا گیا، جنگ بندی ایک مہینہ تک رہی۔ اس کے دوران عربوں نے اس کی ہر ایک دفعہ پر حرف بحرف عمل کیا لیکن اسرائیلی اس موقع سے فائدہ اٹھاکر ہر ممکن طریقے سے اپنی پوزیشن بہتر بنانے میں لگے رہے، جنگ بندی کے معاہدے کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اسرائیل میں ہزاروں غیر ملکی فوجی پہنچ گئے ان میں امریکہ اور برطانیہ کے باقاعدہ فوجیوں کی ایک بھاری تعداد بھی شامل تھی، دونوں سرکاروں نے بعد میں اعتراف کیا کہ "ان کی بری اور ہوائی فوجوں کے یہ ارکان چھٹیاں منانے وہاں گئے تھے"۔

شہزادہ برناڈوٹ نے اپنی رپورٹ میں بھی یہ کہا کہ دنیا بھر کے یہودیوں نے فلسطین پہنچنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے اس نے جنگ بندی کو قائم رکھنا بہت مشکل بنادیا ہے مگر بڑی طاقتوں نے ایسی رپورٹوں کی کوئی پرواہ نہ کی اور دل کھول کر اسرائیل کی مدد اور حوصلہ افزائی کرتے رہے، چار ہفتے بعد جنگ بندی ختم ہوئی تو عرب فوجوں نے پھر کارروائی شروع کی، لیکن سلامتی کونسل

نے ایک بار پھر جنگ بندی کا حکم دیدیا۔

جنگ بندی کے دوران اسرائیل نے اس قدر خلاف ورزیاں کیں اور عرب عوام پر اتنے بڑے مظالم توڑے کہ شہزادہ برناڈوٹ کو مجبوراً سلامتی کونسل سے شکایت کرنا پڑی کہ اسرائیلی رویّے کی بدولت وہ اپنے فرائض کو ٹھیک ڈھنگ سے ادا نہیں کر سکتے، انہوں نے کچھ تجویزیں بھی پیش کیں جن پر عمل کر کے صورت حال کو بہتر بنایا جا سکتا تھا اور فلسطین میں امن قائم کیا جا سکتا تھا، اسرائیلی دہشت پسندوں کی طرف سے ان تجویزوں کا یہ جواب دیا گیا کہ پہلے تو اقوام متحدہ کے اس عظیم نمائندے کو دھمکیاں دی گئیں کہ وہ اپنی "حرکتوں" سے باز آجائے مگر جب ان دھمکیوں کا سوئیڈش شہزادے پر کوئی اثر نہ ہوا تو انہیں دن دہاڑے اسرائیلی مقبوضہ یروشلم میں گولیوں کا نشانہ بنا دیا گیا، اسرائیلیوں کا یہ جرم اس قدر خوفناک تھا کہ چند ممبروں کی واضح ترین اسرائیل نوازی کے باوجود سلامتی کونسل کو یہ ریزولیوشن منظور کرنا پڑا کہ اسرائیل نے شہزادہ برناڈوٹ کی حفاظت میں نہ صرف کوتاہی کی ہے بلکہ ان کے قاتلوں کو پکڑنے کی بھی کوئی عملی کوشش نہیں کی۔ برناڈوٹ کے یہ قاتل اب تک نہیں پکڑے گئے اور اب تو ان میں سے کئی ایک اہم عہدوں پر فائز بھی ہیں۔

مارچ ۱۹۴۹ء میں اقوام متحدہ کے دباؤ، عرب ملکوں کی عام کمزوری اور باہمی نفاق کے باعث اسرائیل اور مصر، شام، لبنان اور اردن کی سرکاروں کے

درمیان جنگ بندی کے معاہدے ہو گئے۔ ان معاہدوں میں یہ بات صاف کر دی گئی تھی کہ یہ عارضی نوعیت کے ہیں اور ان کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عرب ملکوں نے اسرائیل کا وجود قانونی طور پر تسلیم کر لیا ہے۔

جنگ بندی کے ان معاہدوں کے باوجود اسرائیل نے اپنی جارحانہ کارروائیاں کس طرح جاری رکھیں اس کا ذکر ہم کچھ بعد میں کریں گے لیکن یہاں پر کچھ بنیادی حقائق کو سمجھ لینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

عذرِ گناہ

پہلی بات تو یہ ہے کہ جنگ بندی کے بعد دس لاکھ سے زیادہ عربوں کو بلا کسی قصور اور جرم اپنے آبائی گھروں سے نکل کر مہاجرین بن کر دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہونا پڑا، دوسری اہم بات یہ ہے کہ اسرائیل فروری ۱۹۴۹ء میں جس علاقے پر قابض تھا اس کا رقبہ آٹھ ہزار مربع میل تھا یعنی فلسطین کے کُل رقبے کا ۴۰ء۷۷ فی صدی، یہ رقبہ اقوام متحدہ کے تقسیم کے ریزولیوشن کے تحت اسرائیل کو دیئے گئے علاقے سے ۲۱ فی صدی یا ۱۴ لاکھ ۱۵ ہزار ایکڑ زیادہ ہے مگر اب اقوام متحدہ کے نام لیوا اس کھلی جارحیت کا ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

اسی سلسلے کی چوتھی حقیقت جو ہم سب کے لئے قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ تقسیم تو دنیا کے کئی ملک ہوئے ہیں مثال کے طور پر کوریا، جرمنی اور ویٹنام

برصغیر ہندو پاک کی تقسیم سے پیدا ہونے والی تلخی سے بھی ہم اچھی طرح واقف ہیں لیکن فلسطین کی مثال ان سب ہی تقسیموں سے بالکل الگ اور کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے، باقی ملکوں میں ملک تو تقسیم ہوئے تھے لیکن وہاں کے لوگ تقریباً وہیں رہے، ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آبادی کا تبادلہ خاصے بڑے پیمانے اور کافی تکلیف دہ طریقے سے ہوا لیکن پھر بھی یہ ماننا پڑے گا کہ دونوں طرف کے لوگ برصغیر ہی سے تعلق رکھتے تھے، اس کے علاوہ اس تقسیم کو دونوں ملکوں کے مانے ہوئے رہنماؤں کی باقاعدہ تائید حاصل تھی مگر فلسطین کے معاملے میں وہاں کے عوام سے یا ان کے رہنماؤں سے یہ کبھی نہیں پوچھا گیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں، فلسطین دنیا میں ایسی ایک ہی مثال ہے، جہاں کی مقامی آبادی کو پوری طرح سے بے گھر بنا کر وہاں ایسے لوگ آباد کئے گئے جن کا اس سرزمین سے ہزاروں میل دور کا بھی تعلق نہ تھا، اس اعتبار سے فلسطین کی تقسیم کا المیہ دوسری کسی بھی تقسیم سے کہیں زیادہ المناک بھی ہے اور بالکل مختلف بھی۔

یہ بھی یاد رہے کہ فلسطین پر اسرائیلی اپنے کسی بھی دعوے کو آج تک ثابت نہیں کر سکے، سیاسی اعتبار سے ان کے دعوے کی حیثیت صرف اتنی ہے کہ ۱۹۱۷ء میں لارڈ بیلفور نے ان سے وعدہ کیا تھا فلسطین میں یہودیوں کا قومی گھر بنا دیا جائے گا، پہلی بات تو یہ ہے کہ عربوں سے اس صریحاً غداری کے بیان میں بھی یہ کہیں ذکر نہیں کیا گیا کہ قومی گھر کا مطلب ایک علیحدہ اور آزاد ریاست کی تشکیل

ہے دوئم یہ بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ بیلفور کو یہ وعدہ کرنے کا کیا حق تھا۔
دلچسپ بات تو یہ ہے کہ جس وقت یہ وعدہ کیا گیا اس وقت تک فلسطین امانت کے طور پر بھی برطانیہ کی تحویل میں نہیں آیا تھا، یہ کچھ ایسی ہی بات ہے جیسے ایک چور پہلے ہی سے اپنے کسی ساتھی سے یہ کہدے کہ مال غنیمت میں سے تمہیں اتنا حصہ ملے گا، یہ ہم دیکھ ہی چکے ہیں کہ بیلفور اعلان کرنے والوں نے کھلم کھلا یہ تسلیم کیا کہ فلسطین کی ۹۳ فی صدی عرب آبادی کی رائے ان کے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتی، آج کے دور میں ایسے مکارانہ اور عوام دشمن وعدے کی کتنی وقعت ہو سکتی ہے اس پر ہم کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

اسرائیلیوں کا ایک تاریخی دعویٰ بھی ہے وہ یہ ہے کہ آج سے تقریباً دو ہزار سال پہلے فلسطین کے ایک حصے میں تقریباً ستر برس تک ان کی ایک مملکت قائم تھی، اس سلسلے میں قابل غور بات یہ ہے کہ یہودی خود غیر ملکیوں کی حیثیت سے فلسطین میں داخل ہوئے تھے اور ان کی حیثیت کسی بھی دوسرے حملہ آور سے مختلف نہیں تھی، اس زمانہ میں بیسیوں حملہ آور یونان، عراق ایران، روم اور کئی دوسرے ملکوں سے فلسطین آئے اور کچھ دیر حکومت کر کے ختم ہو گئے۔ اگر کسی اور کو اپنے "علاقے" کی واپسی کا حق نہیں ہے تو وہ یہودیوں کو کیسے مل گیا۔ اسی مسئلے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ جس علاقے پر یہ دو ہزار سال پہلے مملکت قائم تھی، اس کا بڑا حصہ موجودہ فلسطین میں تھا ہی نہیں یہ علاقہ

موجودہ شام اور اردن میں ہے اس کے کچھ حصے پر اسرائیل نے حال ہی میں قبضہ ضرور کیا ہے مگر بنیادی طور پر اسرائیل جس علاقے میں قائم کیا گیا وہ پرانی یہودی سلطنت سے بالکل مختلف تھا، شائد اسی بہانے اسرائیلی سامراج اپنی حدود کو لگاتار بڑھانے کی کوشش میں رہتے ہیں اور جب بھی کوئی نیا علاقہ ہتھیاتے ہیں تو اسے قدیم یہودی سلطنت کا حصہ بتاکر اپنا بنا لیتے ہیں۔ بیت المقدس یروشلم کے ساتھ انہوں نے ایسا ہی کیا ہے، سب سے اہم بات یہ ہے کہ آج کی دنیا میں اگر ایسے دعوے تسلیم کئے گئے تو تقریباً ہر ملک کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی، کوئی نہ کوئی ملک اپنے کسی نہ کسی پڑوسی کے بارے میں یہ ضرور کہہ سکتا ہے کہ وہاں پر کبھی اس کی حکومت تھی اس لئے اب اسی کا قبضہ ہونا چاہئے۔ ایسے دعوؤں کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ بھی ہوگا کہ ہم یہ مان لیں کہ دنیا کے ہر حصے میں بسنے والا ہر یہودی خواہ اس کا رنگ کچھ بھی کیوں نہ ہو خواہ وہ کوئی بھی زبان کیوں نہ بولتا ہو اور خواہ یہودی مذہب کے بارے میں وہ کوئی بھی عقیدہ کیوں نہ رکھتا ہو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتا ہے جو دو ہزار سال پہلے فلسطین کے کچھ حصے میں آباد تھی، اس قسم کے اوٹ پٹانگ دعووں کو ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نسلی برتری کے ایسے تمام دعوے تسلیم کرلیں جو ہٹلر اور دوسرے فسطائی لیڈر ہمیشہ کرتے رہے ہیں۔

اب چند الفاظ اسرائیل کے مذہبی دعوے کے بارے میں، یہودی سامراجی اچھی طرح جانتے ہیں کہ تاریخی، قانونی، انسانی، لسانی اور اخلاقی بنیادوں پر وہ کسی قسم کا

کوئی دعویٰ نہیں کر سکتے، عین اسی لئے انہوں نے ایک مذہبی دعویٰ بھی گھڑ رکھا ہے۔ اس دعوے کا لب لباب یہ ہے کہ انجیل مقدس کے مطابق خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ وہ کنعان کی سرزمین کو ان کی اولاد کے لئے وقف کر دے گا۔ صیہونیوں کا کہنا ہے کہ فلسطین میں اسرائیل کا قیام اسی وعدے کی تکمیل ہے۔

اس سلسلے میں کئی باتیں قابل غور ہیں، اولاً تو بے شمار عیسائی عالم یہ ثابت کر چکے ہیں کہ بائبل میں کیا گیا وعدہ خاصا مشروط تھا، یہودیوں نے اسی سرزمین پر حضرت موسیٰؑ کے بعد جو بداعمالیاں کیں اور خدا نے جو ان کی سزا دی اس کے بعد اس مشروط وعدے کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ خود پوپ اعظم پال کا یہ خیال ہے کہ اس وعدے کی مذہبی حیثیت اگر بالکل ہی بے بنیاد نہیں تو بے حد مشکوک ضرور ہے۔ عیسائی مورخوں ہی نے یہ بھی کہا ہے کہ جس سرزمین کنعان کا ذکر بائبل میں موجود ہے اس کا معمولی حصہ ہی موجودہ اسرائیل میں شامل ہے، سوال یہ ہے کہ جو علاقہ "خدائی وعدہ" میں شامل ہی نہیں تھا اس پر اسرائیلی تسلط سے اس وعدے کی تکمیل کیسے ہو گئی؟

کئی یورپین عالموں کا یہ کہنا بھی ہے کہ خدا نے حضرت ابراہیمؑ کی اولاد کو سرزمین کنعان دینے کا اگر وعدہ کیا تھا تو حضرت ابراہیمؑ یہودیوں ہی کے نہیں عربوں یعنی مسلمانوں اور عیسائیوں کے جدِ امجد بھی تھے۔ بلکہ دلچسپ بات تو یہ

ہے کہ یہ وعدہ حضرت اسمٰعیلؑ کی طہارت اور پاکیزگی کے وقت کیا گیا تھا یہودی حضرت اسمٰعیلؑ سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہیں مگر عرب انہیں اپنا جدامجد مانتے ہیں یہودی حضرت اسحٰقؑ کو اپنا جدامجد سمجھتے ہیں۔ جس وقت یہ مبیّنہ خدائی وعدہ کیا گیا اس وقت حضرت اسحٰقؑ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

ان سب حقائق سے بھی اہم بات یہ ہے کہ فلسطین میں بسنے والے ۹۰ فی صدی عوام یعنی مسلمان اس وعدے کی اصلیت میں کوئی یقین نہیں رکھتے بلکہ ان کی مذہبی کتاب میں موجود ہے کہ یہودیوں نے اللہ کو ناراض کیا اور اپنے کئے کی سزا پائی۔ سوال یہ ہے کہ اگر ایک مذہبی کتاب یعنی بائیبل میں موجود ایک خلصے "مشکوک وعدے" کو ایک سیاسی دعوے کی بنیاد مانا جا سکتا ہے تو ایک دوسری اتنی ہی اہم اور قابلِ احترام مذہبی کتاب یعنی قرآن کے واضح ترین الفاظ کو اس دعوے کی نفی کے طور پر اہمیت کیوں نہیں دی جا سکتی؟ سچ تو یہ ہے کہ آج کے دور میں ایسے دعووں میں الجھنا ایک ایسی طولانی بحث کو دعوت دینا ہے جس کا فیصلہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا لیکن جس سے کئی آزاد ملکوں کی آزادی خطرے میں پڑ جائے گی اور ایک زبردست عالمی انارکی کا اندیشہ پیدا ہو جائے گا۔

چوری اور سینہ زوری

اسرائیل کا قیام اور انتہائی بے بنیاد دعوؤں کی بنا پر اس کے "جواز" کا ذکر ہم کر چکے ہیں لیکن جن عرب دشمن جارحانہ کارروائیوں کے لئے اسرائیل کو عرب دنیا کے دل میں ایک ناسور کی طرح پیدا کیا گیا تھا وہ کارروائیاں اس کے قائم ہونے کے ساتھ ختم نہیں ہوئیں بلکہ ایک طرح سے ان کا آغاز ۱۹۴۹ء کے بعد ہی ہوا۔

۱۹۴۸ء سے لے کر اب تک اسرائیل کی ہر حرکت اس کوشش کی تکمیل میں رہی ہے کہ اس کی حدود زیادہ سے زیادہ پھیل جائیں۔ ۱۹۵۶ء میں اسرائیل نے برطانیہ اور فرانس کے ساتھ مل کر مصر پر جو حملہ کیا تھا اسے بھی اسی سلسلے کی ایک بڑی کوشش کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس حملے کے بعد ہی اسے خلیج عقبہ میں جہاز رانی کا حق حاصل ہو گیا تھا۔ ۱۹۵۶ء ہی میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ مصر اور اسرائیل کے درمیان امن قائم رکھنے کے لئے اقوام متحدہ کی ایک فوج اس سرحد پر تعینات ہو جائے۔ اپنی روایتی ہیکڑی دکھاتے ہوئے اسرائیل نے اس

فوج کو اپنی سرزمین پر آنے کی اجازت نہیں دی تھی، اقوام متحدہ اور ہندوستان جیسے ملکوں کے ساتھ اسرائیلی تکبّر اور دھونس کا یہ ثبوت ہے کہ حالیہ حملے کے دوران میں اسرائیلی حملہ آوروں نے اقوام متحدہ کے دستے کے ہندوستانی سپاہیوں کو چن چن کر نشانہ بنایا۔ ہمارے ۱۸ جوان اور ایک نوجوان افسران کی اس جارحیت کا شکار ہو چکے ہیں۔

ہاں تو ذکر ۱۹۵۶ء کا ہو رہا تھا، اس وقت جہاں ایک طرف ہنگامی فوج بنائی گئی، وہاں دوسری طرف یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اسرائیل اور اس کے دوسرے عرب پڑوسیوں یعنی اردن، شام اور لبنان کے درمیان امن قائم کرنے کے لئے ملے جلے فوجی کمیشن بنائے جائیں جن میں اسرائیل اور عرب ملکوں کے اور اقوام متحدہ کے غیر جانبدار فوجی مبصر شامل ہوں یہ کمیشن یوں تو ۱۹۴۸ء ہی سے قائم تھے لیکن اسرائیل نے ان کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں اس نے وعدہ کیا کہ وہ ان سے تعاون کرے گا، لیکن کچھ وقت گزرنے پر اس نے پھر ان کا بائیکاٹ شروع کر دیا۔

اسی دوران میں اسرائیل نے اپنی جارحانہ کارروائیاں کئی محاذوں پر جاری رکھیں، مثال کے طور پر اس نے دریائے اردن کا رخ موڑنا شروع کر دیا۔ اس کے پانی پر اسرائیل قطعی کوئی حق نہیں رکھتا، اس طرح اس کا رخ موڑنے سے شام، اردن اور لبنان کے بڑے حصے ویران ہو جائیں گے، اس

کے علاوہ اسرائیل نے اُن علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا جو معاہدے کے مطابق غیر فوجی علاقے قرار دیئے گئے تھے اور جن پر کسی فریق کو قبضے کا اختیار نہیں تھا۔

اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کا ایک بدترین اظہار اس کا وہ حملہ تھا جو اس کے بیسیوں ٹینکوں اور بکتر بند فوجی دستوں نے نومبر ۱۹۶۶ء میں اردن کے گاؤں سموہ پر کیا اس حملے میں ایک سو سے زیادہ عرب شہری مارے گئے اور کتنی سو سے زیادہ زخمی ہوئے، حملے کے دوران عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو بھی بے دریغ موت کے گھاٹ اتارا گیا، اس حملے کا جواز صرف یہ دیا گیا کہ اس علاقے کی طرف سے اسرائیل کے خلاف توڑ پھوڑ کی کارروائیاں ہوتی تھیں۔ یہ کس قدر بے بنیاد دلیل تھی اس کا ثبوت یہی ہے کہ سلامتی کونسل میں خود امریکہ کو یہ ریزولیوشن پیش کرنا پڑا کہ "جوابی کارروائی کے بہانے اسرائیل کا اردن پر حملہ بالکل ناجائز تھا اور اگر ایسے بہانوں کو تسلیم کرنے کی رسم اپنائی گئی تو عالمی امن خطرے میں پڑ جائے گا۔

تقریباً متفقہ طور پر منظور شدہ اس ریزولیوشن میں اسرائیل کی جن بنیادوں پر مذمت کی گئی عین وہی بنیادیں حالیہ جنگ میں بھی موجود تھیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس بار امریکہ یا اس کے ساتھیوں کو اسرائیل کے خلاف معمولی حد تک بھی زبان ہلانے کی جرأت نہیں ہوئی، کیا اس کی وجہ محض یہ ہے کہ وہ حملہ نسبتاً معمولی سطح پر تھا اور عرب مزاحمت کی وجہ سے کامیاب نہیں ہوا اور حالیہ حملہ بہت

بڑی سطح پر کیا گیا اور اس کے جارحانہ عزائم کی تکمیل میں کوئی شک و شبہ نہیں رہا، ہندوستان نے بہرحال سموہ پر حملے کی بھی سخت ترین الفاظ میں مذمت کی تھی اور وہ اسرائیلی جارحیت کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے۔

پچھلے برسوں میں اسرائیل نے یوں تو بے شمار جارحانہ کارروائیاں کیں مگر کئی بار اس نے ایسی شدید قسم کی دھاندلی دکھائی کہ سلامتی کونسل کو بھی چھ بار اس کی مذمت کا ریزولیوشن پاس کرنے پر مجبور ہونا پڑا (یاد رہے کہ سلامتی کونسل کے ارکان میں امریکہ اور برطانیہ بھی شامل ہیں) اقوام متحدہ میں ۲۷ بار اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کے خلاف ریزولیوشن منظور ہو چکے ہیں۔ دنیا کے کسی ملک کے خلاف اقوام متحدہ کو اتنی مرتبہ آواز اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی مگر عربوں نے دنیا کو ایک بار بھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا، مغرب والوں نے اسرائیل ہی کی پیٹھ ٹھونکی ہے اور عربوں ہی کو قصوروار ٹھہرایا ہے۔ سچ ہے جسے چاہے پیا وہی سہاگن۔

اسرائیل نے اب تک اقوام متحدہ کے ان ۲ درجن سے زیادہ ریزولیشنوں کی پروا بھی نہیں کی جن میں کہا گیا تھا کہ اسرائیل سے نکالے ہوئے عربوں کو اپنے وطن واپس جانے یا اگر وہ چاہیں تو مناسب معاوضہ لینے کا حق حاصل ہونا چاہئے اسرائیلی بڑی ڈھٹائی سے کہتے رہتے ہیں کہ ہم ایک بھی عرب کو واپس نہیں آنے دیں گے۔

اسرائیلی جارحیت کا یہی روپ سب سے خطرناک ہے کہ اس نے اپنے جارحانہ عزائم کے سامنے عالمی رائے عامّہ کی کوئی پروا نہیں کی۔ حال ہی میں اقوام متحدہ کی عام اسمبلی میں اس کے خلاف سنو سے زیادہ ملکوں کی اکثریت کے ساتھ یروشلم پر اس کے قبضے کے خلاف دو[۲] ریزولیوشن پاس ہو چکے ہیں مگر اسرائیلی لیڈر انہیں انتہائی حقارت سے ٹھکرا رہے ہیں، خیر اس ضمن میں تفصیلی بات آگے چل کر ہو گی۔ ان تمام حرکتوں کے باوجود اسرائیل کی طرف سے شور ہوتا رہتا ہے کہ پڑوسی عرب ملکوں کی طرف سے اس کے خلاف توڑ پھوڑ کی کارروائیاں ہوتی رہتی ہیں، اس لئے وہ ان ملکوں کے خلاف سخت قدم اٹھانے پر "مجبور" ہو جاتا ہے، یہ بات کتنی لغو ہے، اس کا ثبوت یہی ہے کہ اسرائیل ایک بار اس پر تیار نہیں ہوتا کہ اقوام متحدہ ایسے غیر جانبدار ادارے کے مبصر اس کے الزاموں کی تصدیق کر لیں۔

جارحانہ "مجبوریاں"

حالیہ حملے کی شروعات بھی ایسے ہی اوٹ پٹانگ الزاموں سے ہوئی تھی، کچھ عرصے سے اسرائیل شور مچا رہا تھا کہ شام کی طرف سے اس کے علاقے میں تخریب کار آتے ہیں۔ اگر انہیں روکا نہ گیا تو اسرائیل دمشق تک قبضہ کرنے سے گریز نہیں کریگا ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسا ہی جھوٹ تھا جیسا اسرائیل نے سنہ ۱۹۵۶ء میں مصر پر حملہ کرتے وقت گھڑا تھا، عرب جانتے تھے کہ اسرائیل کا اصل مقصد شام کی آزادی کو ہڑپ کرنا ہے، اس کے ساتھ ہی وہ اردن کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ اس موقع پر

متحدہ عرب جمہوریہ کے پاس اس کے سوا کوئی اور چارہ ہی نہیں تھا کہ وہ شام کے ساتھ اپنے معاہدے کا پاس کرتے ہوئے براہ راست اس کی مدد کو آئے۔ یہ اسی صورت میں ممکن تھا جب ہنگامی فوج اس علاقہ سے ہٹ جائے۔ چنانچہ مصر نے اقوام متحدہ کے ساتھ اپنے سمجھوتے کا حق استعمال کرتے ہوئے اسے ہٹانے کا مطالبہ کیا، جسے منظور کر لیا گیا۔

متحدہ عرب جمہوریہ نے اس کے فوراً بعد خلیج عقبہ سے اسرائیلی جہازوں کے گزرنے کی ممانعت کر دی۔ صدر ناصر کا یہ قدم عالمی قانون کے عین مطابق تھا، خلیج عقبہ بحیرۂ قلزم پر کوئی ۹۸ میل لمبی ایک خلیج ہے جس کے ایک کنارہ پر متحدہ عرب جمہوریہ ہے اور دوسرے پر سعودی عرب، کسی زمانے میں اسی راستے سے مصری حاجی حجاز جایا کرتے تھے۔ شروع دور کے مسلمان عربوں نے جب مصر فتح کیا تھا تو یہی راستہ اپنایا تھا، یہ خلیج عقبہ یوں تو چودہ میل چوڑی ہے لیکن اس میں جہاز رانی کے قابل چار میل چوڑی آبنائے طیران ہی ہے جو جزیرہ طیران (جو سعودی عرب کی عمل داری میں ہے) اور مصری ساحل پر شرم الشیخ کی چوکی کے درمیان بہتی ہے، سخت چٹانوں کی وجہ سے کوئی بھی جہاز مصری ساحل سے ایک میل سے زیادہ دور نہیں رہ سکتا۔

عالمی قانون کے تمام قاعدوں کے مطابق ایسی آبناؤں اور خلیجوں پر ان ہی ملکوں کا اختیار ہوتا ہے جو اس کے آس پاس اختیار رکھتے ہیں۔ اس کے

باوجود اسرائیل اس خلیج کے ذریعہ جس بندرگاہ ایلات تک اپنے جہاز لے جاتا ہے اس پر بھی اس نے زبردستی ۱۹۴۹ء میں قبضہ کیا تھا، اقوام متحدہ نے تقسیم فلسطین کا جو منصوبہ بنایا تھا اس میں ایلات شامل نہیں تھا۔ گویا اس علاقے پر اسرائیل کا اپنا قبضہ بھی قطعاً ناجائز تھا۔ ان ہی حقائق کی بنا پر عربوں نے اس خلیج سے اسرائیلی جہازوں کو گزرنے کی ممانعت کر دی، اس پر اسرائیل نے خوب شور مچایا مغربی ملکوں نے بھی اس معاملے میں دل کھول کر اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ ہندوستان اور کئی افریشیائی ملکوں نے عربوں کی پر زور حمایت کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔

بدی کا بہانہ

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ حالیہ حملے کی شروعات مصر کی طرف سے خلیج عقبہ کو اسرائیلی جہازوں پر بند کرنے سے ہوئیں، ہو سکتا ہے کہ یہ بات کسی حد تک درست ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلیج عقبہ کا سوال کوئی اہم سوال نہیں تھا۔ اوتھانٹ نے ۲۳ مئی ۱۹۶۷ء کو سلامتی کونسل کو جو رپورٹ پیش کی اس میں بھی انہوں نے کہا تھا کہ بحران کی اصلی وجہ نہ تو اقوام متحدہ کی فوجوں کا صحرائے سینا سے ہٹایا جانا ہے اور نہ ہی خلیج عقبہ کی ناکہ بندی بلکہ اس کی وجہ وہ تمام مسائل ہیں جنھوں نے پچھلے بیس سال میں وسط مشرق کے امن کے لئے خطرے پیدا کر دیئے ہیں، اپنی اس رپورٹ میں اوتھانٹ نے واضح ترین الفاظ میں لکھا تھا کہ عرب اسرائیلی سرحدوں پر تعینات اقوام متحدہ کے فوجی مبصروں کی طرف سے انہیں جو رپورٹیں موصول ہوئی ہیں

ان سے پتہ چلتا ہے کہ شامی اسرائیلی سرحد پر اسرائیل کی فوجی تیاریوں نے انتہائی خطرناک صورت حال پیدا کر دی ہے، اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل نے اپنی رپورٹ میں مزید کہا کہ اسرائیل نے کئی باران تیاریوں سے باز رہنے کا وعدہ کیا لیکن اس کے باوجود اس کی تیاریاں جاری رہی ہیں۔ اس سے قبل ۱۵ مئی کو اپنے "قومی دن" کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے اسرائیل کے وزیر اعظم اشکول نے کہا تھا کہ اسرائیل کے صبر کی حد ہو چکی ہے اور شامیوں کو سبق سکھانے کے لئے اگر ضرورت پڑی تو اسرائیل دمشق تک پہنچنے سے گریز نہیں کرے گا۔"

اسی دوران اسرائیل نے سلامتی کونسل کی ہر ایسی کوشش کو ناکام بنا دیا جس کا مقصد مغربی ایشیا میں امن قائم رکھنا تھا مثال کے طور پر اسرائیل اور اس کے مغربی حامیوں نے ہندوستان کی یہ سیدھی سی تجویز منظور نہیں کی کہ اسرائیل اور اس کے ساتھ لگنے والے تمام عرب ملکوں کی سرحد پر اقوام متحدہ کے فوجی مبصر زیادہ بڑی تعداد میں تعینات کئے جائیں یہ تجویز بھی تھی کہ عرب اسرائیل جنگ بندی کے مشترکہ کمیشن دوبارہ کام شروع کر دیں۔ ۱۹۴۹ء کے جنگ بندی معاہدوں کے تحت قائم کئے گئے ان کمیشنوں میں اقوام متحدہ، اسرائیل اور متعلقہ عرب ملکوں کے فوجی نمائندے شامل تھے مگر اسرائیل نے اوٹ پٹانگ بہانوں کی بنا پر ان کمیشنوں کا بائیکاٹ کر رکھا ہے۔ حالیہ جنگ سے پہلے اسرائیل نے ان کمیشنوں کو دوبارہ موثر بنانے کی ہندوستانی تجویز کو رد کر کے یہ ظاہر کر دیا کہ اس کے اس شور شرابے میں کوئی وزن

نہیں تھا کہ عرب ملک ہی اس کے خلاف فوجی تیاریاں کر رہے تھے اس نے یہ تجویز اسی لئے رد کی کہ اس کی جارحانہ کارروائیوں میں کوئی رکاوٹ نہ آنے پائے۔ ایک سیدھا سا سوال یہ بھی ہے کہ اگر خلیج عقبہ پر اسرائیلی دعوے میں کوئی بھی وزن ہوتا تو اسرائیلیوں کو عربوں کی طرف سے متعدد بار دہرائی گئی اس پیش کش کو ماننے سے کبھی انکار نہ ہوتا کہ اس مسئلے پر عالمی عدالت کی رائے لے لی جائے۔

آستین کا لہو

بیشتر اس کے کہ ہم حالیہ جنگ کا ذکر کریں چند واقعات خاص طور پر قابل غور ہیں۔ پہلا غور طلب امر تو یہ ہے کہ اسرائیلی حملے سے پہلے امریکہ نے بار بار یقین دہانی کروائی کہ وہ مغربی ایشیا میں کسی بھی فریق کو جنگ میں پہل کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ مثال کے طور پر ۲۳ر مئی کو امریکی صدر نے نہایت ہی صاف لفظوں میں اعلان کیا کہ "مشرق قریب کے سب ہی ملکوں سے میں وہی بات دہرانا چاہتا ہوں جو امریکہ کے تین صدر پہلے کہہ چکے ہیں وہ یہ ہے کہ امریکہ سب ہی ملکوں کی آزادی اور علاقائی یک جہتی میں یقین رکھتا ہے امریکہ کسی بھی قسم کے براہ راست یا بالواسطہ حملے کی پورے زور سے مخالفت کرے گا خواہ وہ کسی بھی فریق کی طرف سے کسی بھی بہانے شروع کیا گیا ہو۔"

اسی دن امریکی سفیر نے متحدہ عرب جمہوریہ کے وزیر خارجہ سے ملاقات کر کے انہیں باقاعدہ یقین دلایا کہ اگر وہ پہل نہ کریں تو امریکہ اس بات کی ذمہ داری لیتا

ہے کہ وہ اسرائیل کی طرف سے کئے گئے کسی بھی جارحانہ حملے کی بھرپور مخالفت کریگا
۲۳ر مئی ہی کو امریکی صدر نے صدر ناصر کو ایک ذاتی پیغام بھیجا اور اس میں کہا
گیا کہ میں آپ سے پرخلوص اپیل کرتا ہوں کہ آپ اپنے عوام، اپنے علاقے کے امن
اور عالمی برادری کے مفاد کا خیال رکھتے ہوئے ہر ممکن کوشش کریں کہ...
.. جنگ کا آغاز نہ ہونے پائے، انہوں نے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ امریکی
نائب صدر کو قاہرہ بھیج سکتے ہیں تاکہ حل طلب معاملے آمنے سامنے طے
ہوجائیں، صدر ناصر نے اس تجویز کا خیر مقدم کرتے ہوئے جواب دیا کہ وہ
اپنے ملک اور دوسرے عرب ملکوں کے دفاع کے علاوہ اور کسی فوجی اقدام
میں دلچسپی نہیں رکھتے، انہوں نے یہ بھی کہا کہ متحدہ عرب جمہوریہ کے نائب
صدر امریکی نائب صدر سے بھی پہلے واشنگٹن جاکر امن کی کوششوں کو
تقویت پہنچانے کے لئے تیار ہیں ۳ر جون کو امریکی وزارت خارجہ نے صدر ناصر
کے اس بیان کا خیر مقدم کرتے ہوتے جناب زکریا محی الدین کو ۷ر جون کو
واشنگٹن آنے کی دعوت دیدی۔

۲۶ر مئی کو امریکی نائب وزیر خارجہ مسٹر روسٹوف نے واشنگٹن میں مقیم
مصری سفیر کو بلایا اور ان سے بات چیت کی، یہ بات چیت اس حقیقت کی
بدترین مثال ہے کہ بڑی طاقتوں نے کس طرح عربوں کی پیٹھ میں
چھرا گھونپا، روسٹوف نے مصری سفیر کو بتایا کہ اسرائیلی

وزیر خارجہ نے شکایت کی ہے کہ متحدہ عرب جمہوریہ اگلے دن اسرائیل پر ایک زبردست حملہ کرنے والا ہے۔ روستوف نے مصری سفیر سے کہا کہ اگر ایسا ہوا تو اس کے نتائج انتہائی سخت ہوں گے، اپنے طور پر امریکہ پوری کوشش کرتا رہے گا کہ اسرائیل کسی بھی فوجی قدم سے باز رہے۔

یکم جون کو امریکی وزیر خارجہ ڈین رسک نے یہی بات متحدہ عرب جمہوریہ کے سفیر سے پھر دہرائی۔ اسی دوران روس اور امریکہ کے درمیان بھی خفیہ نامہ و پیام جاری رہا۔ امریکہ کی طرف سے روس کو دی گئی یقین دہانیوں کی بنا پر روس کی طرف سے دو بار (۲۶ مئی اور ۳۰ جون) کو متحدہ عرب جمہوریہ پر باقاعدہ سرکاری مراسلوں میں زور دیا گیا کہ وہ اپنی طرف سے کوئی پہل نہ کرے

زبانِ خنجر

ان ہی یقین دہانیوں کی بنا پر متحدہ عرب جمہوریہ نے سیاسی اور فوجی اندازے کی دو خطرناک ترین غلطیاں کر ڈالیں۔ پہلی تو یہ کہ اسرائیلی فوجی کارروائی کے خلاف فوری جوابی کارروائی کا خیال ترک کر دیا گیا۔ شائد اس سے بھی بڑی دوسری غلطی یہ کی کہ اسرائیلی ہوائی حملے کا مقابلہ کرنے کے لئے جو مصری ہوائی جہاز دن رات لگاتار اڑانیں کیا کرتے تھے ان کی نگراں اڑانوں کا سلسلہ تیل کی کفایت کے خیال سے بند کر دیا گیا، یاد رہے کہ ایک جیٹ ہوائی جہاز کی ایک گھنٹے کی اڑان پر کم از کم ڈھائی سو گیلن پٹرول خرچ آتا ہے اور ایسی

اڑانوں کے لئے تقریباً اسیؔ ہوائی جہازوں کے ہر وقت ہوا میں رہنے کی ضرورت تھی۔

بہر حال جہاں مصر نے یقین دہانیوں کی بنا پر اپنی فوجی تیاریوں میں ڈھیل دینے کی بھیانک غلطی کی وہاں امریکیوں اور انگریزوں نے پوری شدت کے ساتھ اسرائیلی حملہ آوروں کو مدد بہم پہنچانی شروع کر دی۔ ۱۹۵۶ء میں نہر سویز پر حملے کی ناکامی سے سبق حاصل کرتے ہوئے سامراجیوں نے اپنے حالیہ حملے کے دوران براہ راست حصہ نہیں لیا لیکن بالواسطہ حملے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، عرب ملکوں کی آزادی پر یہ بالواسطہ حملہ کئی طریقوں سے کیا گیا۔

عرب ملکوں کے خلاف حالیہ سامراجی سازش کی پوری کڑیوں کا ابھی تک پتہ نہیں چل سکا، ظاہر ہے کہ ایسے انکشافات کو سامنے آتے ہوئے کچھ وقت لگتا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں مصر پر جو حملہ کیا گیا تھا اس کی صحیح نوعیت کے انکشاف کو بھی آٹھ برس لگ گئے تھے اب آئزن ہاور کی اس زمانے کی ذاتی ڈائری، موشے دایان کی خود نوشت یادداشت اور برطانیہ کے نائب وزیر جنگ انیٹونی نٹنگ کی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی یہ پتہ چلا ہے کہ ۱۹۵۶ء کی سازش کتنی گہری تھی۔ بہر حال موجودہ حالات میں بھی چند ناقابل تردید حکایات اور شہادتیں ایسی ہیں جو اس عظیم سازش کے کئی پہلو بے نقاب کرتی

ہیں ان میں سے چند ایک حسب ذیل ہیں۔

۱- ۱۵ مئی ہی سے امریکی جاسوس ہوائی جہازوں نے متحدہ عرب جمہوریہ کے اوپر اڑانیں شروع کر دی تھیں۔ ان اڑانوں میں یو۔ ٹو قسم کے جہاز.. اور جاسوسی کرنے والے طیارے استعمال کئے گئے، اس کی شہادت ان گرفتار شدہ اسرائیلی پائلٹوں نے دی ہے جو حالیہ حملے سے کچھ ہی پہلے امریکہ سے اسرائیل گئے تھے۔

۲- حالیہ حملے سے کچھ ہی پہلے متحدہ عرب جمہوریہ، شام اور اسرائیلی ساحل کے آس پاس امریکی اور برطانوی جہازوں کی زبردست نقل و حرکت دیکھی گئی۔ ان جنگی جہازوں میں امریکہ کا چھٹا بحری بیڑہ بھی شامل تھا، اس بحری بیڑے میں ایک بڑی تعداد ایسے جہازوں کی ہے جنہیں تیرنے والے ہوائی اڈوں کا نام دیا جا سکتا ہے، یہ خیال اغلب ہے کہ ۵ جون کو متحدہ عرب جمہوریہ پر جو ہوائی حملے کئے گئے ان میں سے کئی ہوائی جہاز ان طیارہ بردار امریکی جہازوں ہی سے اڑے ہوں گے۔ اس خیال کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ اکثر اسرائیلی ہوائی جہاز ۱۵ یا ۲۰ منٹوں میں اڑانیں کر کے مصری اڈوں پر پہنچ گئے حالانکہ جس راستے سے وہ آئے تھے اس سے وہاں پہنچتے ہوئے انہیں کم از کم ۲۵ یا ۳۰ منٹ ضرور لگتے۔ جس راستے سے اسرائیلی ہوائی جہاز مصری اڈوں پر پہنچے اس کا فاصلہ ۳۵۰ سو میل سے زیادہ تھا۔ ان میں سے بعض جہاز اتنے ہلکے تھے

کہ وہ اسرائیلی اڈوں سے اڑ کر وہیں پر واپس جانے کے لئے کم از کم ۷۰۰، ۸۰۰ میلوں کی مسافت کا پٹرول اپنے ساتھ نہیں لا سکتے تھے یہ بھی یاد رہے کہ ہوائی حملے پر جانے والے جہازوں کو اس طرح سے راستہ کاٹنا پڑتا ہے اور دشمن کے جہازوں سے لڑنے یا ان سے بچ نکلنے کے لئے اتنی زیادہ اڑان کی ضرورت ہوتی ہے کہ انہیں ایک عام سفر کے مقابلے میں کم از کم تین گنا زیادہ پٹرول چاہیئے، یہ تمام پٹرول اور ساز و سامان انہیں چھٹے بحری بیڑے کے طیارہ بردار جہازوں ہی سے ملا۔ سینائی میں گرائے جانے والے ایک اسرائیلی جہاز سے کئی خطرناک قسم کے میزائل اور ایسا جنگی سامان برآمد ہوا ہے جو صرف امریکہ ہی کے پاس ہے اور جو اس نے آج تک اپنے کسی ساتھی یا دوست ملک کو نہیں دیا۔

۳۔ ۳۱ رمئی ۱۹۶۷ء کو ریڈیو پیرس کے ایک نشریہ میں بتایا گیا کہ ۲۰۰ کنیڈین یہودی فوجی اسرائیل کو جاتے ہوئے پیرس سے گزرے۔ ریڈیو کے بیان کے مطابق وہ پہلی جون کو اسرائیل پہنچنے والے تھے اسی ریڈیو نے اسی نشریہ کے دوران یہ انکشاف بھی کیا کہ مالٹہ، قبرص اور اسی علاقے میں دوسرے برطانوی فوجی اڈوں پر بڑی ہی پراسرار قسم کی فوجی سرگرمیاں دیکھی گئی ہیں یہ اس بات کا بھی کھلے عام چرچا تھا کہ امریکہ اور برطانیہ کے تربیت یافتہ یہودی فوجی افسر اور ہوا باز والنٹیروں کی صورت میں دھڑا دھڑ اسرائیل پہنچ رہے ہیں۔

۴۔ ترکی کے مشہور اخبار "اقسام" کی ۷ر جون کی اشاعت میں امپالی کے امریکی فوجی اڈے میں کام کرنے والے ایک ترک ملازم کا خط شائع ہوا کہ اس اڈے پر موجود سب ہی امریکی جنگی ہوائی جہازوں پر ۳ر اور ۴ر جون کو امریکی جھنڈے کے نشانات کو مٹا کر اسرائیل کا نشان داؤد کا ستارہ لگا دیا گیا، اس کے فوراً بعد ایف ۱۰۴ قسم کے ان جنگی ہوائی جہازوں کو اسرائیل کی طرف اڑتے ہوئے دیکھا گیا۔

برطانوی اخبار ڈیلی ٹیلیگراف کی ۲۵ر مئی کی اشاعت میں یہ انکشاف موجود ہے کہ اسرائیل کو برطانیہ اور امریکہ سے کئی قسم کا فوجی سامان دھڑا دھڑ پہنچنا شروع ہو گیا ہے۔

۱۹ر مئی ہی کو امریکی فوجی کمان نے لیبیا میں وہلس میں اپنے فوجی اڈے میں ہنگامی صورت حال کا اعلان کر کے سب ہی مقامی ملازموں کو اس کے آس پاس آنے کی مناہی کر دی، اس دوران اس سارے علاقے میں امریکی ہوائی جہازوں کی بڑی ہی پراسرار نقل و حرکت دیکھی گئی۔

لڑائی سے کچھ پہلے اور اس کے بعد امریکی جاسوس جہاز لبرٹی خلیج عقبہ کے دہانے پر موجود تھا، فوجی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کے لئے اس جہاز پر جو ساز و سامان موجود ہے اسے دنیا بھر میں بہترین تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسی جہاز میں ایسا سامان بھی موجود ہے جس کی مدد سے آس پاس کے ساحل پر لگائے ہوئے

راڈر کے آلے جام کر کے ناکارہ بنائے جاسکتے تھے۔ صاف ظاہر ہے کہ ۵ رجون کی صبح کو اسرائیلیوں نے جو حملہ کیا وہ اس لئے بھی کامیاب رہا کہ لیبرٹی اور اسی قسم کے دوسرے امریکی جہازوں پر لگے بہترین قسم کے نیوکلیئر آلوں کی بدولت مصری راڈر سسٹم جام ہوکر ہوائی جہازوں کا پہلے سے پتہ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ یہ جہاز لیبرٹی مصری ساحل کے اس قدر قریب تھا کہ شرم الشیخ کی چوکی کے پاس اسرائیلی اندھا دھند بمباری کا نشانہ بھی بن گیا، امریکی رسالہ "نیوز ویک" (۱۶ رجون) کے مطابق امریکہ ہی کے کچھ اعلیٰ فوجی مبصروں کا خیال ہے کہ اس جہاز پر اسرائیلیوں نے جان بوجھ کر بمباری کی تاکہ اگر کچھ سال بعد خود امریکہ میں اس بات کی تحقیقات ہو کہ اسرائیل کو فوجی مدد کیوں اور کیسے پہنچائی گئی تھی تو اس کا کوئی واضح ثبوت نہ ملے۔ بہرحال یہ صاف ظاہر ہے کہ عین جنگ کے دوران لبرٹی جیسا اہم ترین امریکی جہاز مصری ساحل کے اتنا نزدیک تھا کہ آسانی کے ساتھ زمینی توپوں کی گولہ باری کی زد میں آگیا۔

ناقابلِ تردید

اسرائیلی، امریکی اور برطانوی ملی بھگت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ خود اسرائیل نے ہمیشہ یہ کہا ہے کہ اس کے پاس تقریباً ۱۲۵ جنگی ہوائی جہاز ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ کے فوجی ماہرین کھلم کھلا اس بیان کی تصدیق کرتے رہے ہیں لیکن ۵ رجون کو صبح نو بجے اسرائیل کے ہوائی جہازوں نے مصر کے گیارہ ہوائی

اڈوں اور دوسرے فوجی اہمیت کے نو مقامات پر بیک وقت بمباری کی۔اسی کے ساتھ شام کے دو اور عراق کے ایک ہوائی اڈے کو بھی نشانہ بنایا گیا مطلب یہ ہے کہ اسرائیل نے بیک وقت ۲۳ مقامات پر حملے کئے ایسے شدید ایک ہی حملے کے لئے کم ازکم ۲۴ ہوائی جہازوں کی ضرورت ہوتی ہے گویا اسرائیل کو پہلے ہی حملے کے لئے کم ازکم ۵۵۲ جنگی ہوائی جہازوں کی ضرورت تھی، اسرائیل کے اپنے بچاؤ، فوجیوں کی نقل وحرکت اور عام دیکھ بھال کے لئے جو جہاز درکار ہوں گے وہ ان کے علاوہ تھے، یہی نہیں بلکہ مصری ہوائی اڈوں پر چار بار حملے کئے گئے یہ حملے آدھے گھنٹے بعد ہوئے۔ گویا پہلے اور چوتھے حملے میں صرف ۱۲۰ منٹ کا وقفہ تھا۔ اتنے کم عرصے میں حملہ کرنے والے جہاز اسرائیلی ہوائی اڈوں سے تازہ دم ہو کر واپس نہیں آسکتے تھے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اوّل تو کچھ ہوائی جہازوں نے قریب ہی کھڑے امریکی طیارہ بردار جہازوں کو اڑانوں کے لئے استعمال کیا ہوگا لیکن زیادہ تر اڑانیں ہر ایک ہوائی جہاز نے ایک ہی بار کی۔ گویا پہلے دن کے ہوائی حملوں کے لئے اسرائیل کو کم ازکم ۲۰۰۰ ہزار جنگی ہوائی جہازوں کی ضرورت تھی۔ ان ہوائی حملوں کے علاوہ ۵ رجون ہی کو اسرائیل نے اردن کے شہری اور فوجی نشانوں پر بھی وسیع پیمانے پر بمباری کی اور صحرائے سینائی میں بھی زبردست طریقے پر اپنی ہوائی فوج کو استعمال کیا ایسے حملوں کے لئے بھی کم ازکم تین چار سو ہوائی جہازوں کی ضرورت ضرور ہوگی اگر اس میں اسرائیل کے

اپنے دفاع کے لئے استعمال کئے جانے والے ہوائی جہاز بھی شامل کر دیئے جائیں تو ۵ رجون کو اسرائیل کے پاس لگ بھگ ۳۰۰۰ ہزار ہوائی جہاز موجود ہونے چاہیئے ۔سوال یہ ہے کہ اسرائیل کے سوا سو جہازوں کے مقابلے میں اتنی بڑی تعداد میں اس کے پاس یہ ہوائی جہاز کہاں سے آئے ان کی پرواز کہاں سے ہوئی اور ان کی دیکھ بھال اور ان میں استعمال ہونے والے پٹرول اور اسلحہ کو کس نے فراہم کیا اور اسرائیل کے پاس اتنی بڑی تعداد میں اتنے زیادہ پائیلٹ، نیوی گیٹر (راستہ دکھانے والا) اور عام دیکھ بھال کرنے والے لوگ کہاں سے آگئے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک جنگی ہوائی جہاز کو اڑانے، ہوائی اڈے پر اس کی دیکھ بھال کرنے اور اسے مناسب سامان سے لیس کرنے کے لئے اوسطاً کم از کم ۲۵ آدمی درکار ہوتے ہیں۔ اسرائیل نے اتنی بڑی ہوائی فوج کہاں سے حاصل کی؟ جواب صاف ہے کہ اپنے سرپرستوں یعنی امریکہ اور برطانیہ سے۔

منہ میں رام

اسرائیل نے کس طرح مکاری اور عیاری کے ساتھ ساری دنیا کو دھوکا دیا اس کے چند اور ثبوت ملاحظہ ہوں۔ عرب اسرائیل تناؤ کے دوران مئی کے آخری ہفتہ میں سوویت وزیر اعظم الیکسی کوسی جن نے ایک خط میں اسرائیلی وزیر اعظم سے اپیل کی تھی کہ وہ کسی جارحانہ قدم سے باز رہیں۔ اس میں

کہا گیا تھا کہ ہم آپ سے اپیل کرتے ہیں کہ آپ پوری کوشش کریں کہ فوجی تنازعہ کی نوبت نہ آئے کیونکہ اس طرح سے ساری دنیا کے امن پر خاصا برا اثر ہو سکتا ہے، ہمیں امید ہے کہ آپ اس اپیل پر دھیان دیتے ہوئے کسی ایسے قدم سے باز رہیں گے جو کہ متعلق اقوام کے لئے انتہائی نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔"

اشکول نے انتہائی عیاری کے ساتھ اس اپیل کا جواب دیا اس نے لکھا کہ اسرائیل صرف یہی چاہتا ہے کہ اقوام متحدہ کے اصولوں کی تہہ دل کے ساتھ پیروی کرتا رہے یہ اصول ہیں :-

سب ہی ملکوں کی علاقائی سالمیت کا احترام، طاقت کے ذریعہ سرحدوں میں کسی قسم کی تبدیلی کی مخالفت، برّی اور بحری ناکہ بندیوں سے احتراز اور دوسرے ملکوں کے اندرونی معاملوں میں عدم مداخلت۔"

(یروشلم پوسٹ ۵ جون ۱۹۶۷ء)

۲۸ مئی کو اشکول نے اپنی پارلیمنٹ سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وزیر خارجہ نے اپنے غیر ملکی دورے کے بعد ہمیں مطلع کیا ہے کہ سب ہی ملک یہ چاہتے ہیں کہ وسط مشرق کی علاقائی سالمیت قائم رہے۔ صدر امریکہ اور برطانوی وزیر اعظم تو اس سوال پر خاصے سخت بیانات بھی جاری کر چکے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف اسرائیل کی فوجیں جارحانہ حملے کی

تیاریاں کر رہی تھیں دوسری طرف اس کے لیڈر امن اور علاقائی سالمیت قائم رکھنے کی دہائی دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ موشے دایان نے بھی جسے چند ہی روز پہلے کابینہ میں شامل کیا گیا تھا یہی کہا کہ اسے پورا یقین ہے کہ اقوامِ متحدہ کی کوششوں سے یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ فوجی نامہ نگاروں سے ۳ جون کو بات چیت کرتے ہوئے اس نے زور دیا کہ جھگڑے کو ڈپلومیسی کے پرامن طریقوں سے ہی حل کرنا چاہیے۔

ایک نامہ نگار نے پوچھا کہ اگر ابھی لڑائی کی نوبت آجائے یا اگر ایک مہینہ بعد آپ کو لڑنا پڑے تو کیا آپ جیت سکتے ہیں؟ مسکراتے ہوئے دایان نے جواب دیا کہ ہم جیت سکتے ہیں لیکن مجھے حیرت ہے کہ آپ نے یہ سوال پوچھا ہی کیوں؟ میرا خیال ہے کہ ایک مہینہ تو کیا اگلے دو تین بلکہ چھ مہینوں تک جنگ کی نوبت ہی نہیں آئے گی۔

(یروشلم پوسٹ ۵ جون ۱۹۶۷ء)

ظاہر ہے کہ عین اسی وقت دایان اپنی فوجوں کو عربوں پر حملہ کرنے کا حکم دے چکا ہوگا۔ یہ بات اب سب ہی جانتے ہیں کہ حملے کے وقت کا فیصلہ اسرائیلی کابینہ نے ۳۶ گھنٹے پہلے کر لیا تھا، واشنگٹن پوسٹ کے نامہ نگار برنارڈ نوستار نے اس بات کی تصدیق کی ہے۔ یہ نامہ نگار جنگ ہوتے وقت تل ابیب میں ہی تھا۔

(واشنگٹن پوسٹ ۱۶ جون ۱۹۶۷ء)

"فتح" کی حقیقت

یہ تھا وہ پس منظر جبکہ ۵ رجون کی صبح کو جب سلامتی کونسل میں اسرائیلی نمائندہ بار بار یقین دلا رہا تھا کہ اس کا ملک کبھی حملہ نہیں کرے گا۔ تو اسرائیل نے حالیہ تاریخ کے بدترین جارحانہ حملے کا آغاز کر کے متحدہ عرب جمہوریہ، اردن اور شام پر ہوائی حملے شروع کر دیئے۔ اس کے ساتھ ہی صحرائے سینائی میں متحدہ عرب جمہوریہ کے خلاف اور یروشلم پر اردن کے خلاف چڑھائی کر دی گئی پانچ دن بعد اسرائیل اس بات پر یقیناً خوشیاں منا سکتا تھا کہ اس کا حملہ تقریباً لامثال طور پر کامیاب رہا، سچ تو یہ ہے کہ جنگ کا فیصلہ پہلے ہی دو گھنٹہ میں ہو گیا تھا جن کے دوران مصری اور اردنی ہوائی فوج کی کمر ٹوٹ گئی، فوجی ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ صحرائے سینائی جیسے علاقے میں لڑائی کے لئے ہوائی طاقت کو واضح برتری حاصل ہوتی ہے۔ ایسے علاقوں میں چونکہ ہوائی حملوں سے بچاؤ کی کوئی اوٹ نہیں ہوتی اس لئے زمینی فوج لاکھ کوشش کرے وہ ہوائی حملوں کی تاب نہیں لا سکتی۔

اس جنگ میں اسرائیل کی کامیابی کی سب سے بڑی وجہ تو وہ سیاسی سفارتی اور فوجی امداد ہی تھی جو امریکہ برطانیہ اور اسرائیل کی ازلی ملی بھگت کے کارن اسرائیلی حملہ آوروں کو ملی۔ اس کا کچھ ذکر ہم کر چکے ہیں اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اسرائیل کو جتنی غیر ملکی مدد ملی ہے اس کا فی کس اوسط

کسی بھی دوسرے ملک کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہے۔ اسرائیل کو ملنے والی فوجی، غیر فوجی، سرکاری اور غیر سرکاری، غیر ملکی امداد کا روزانہ اوسط اب تقریباً ساڑھے تین کروڑ روپے بیٹھتا ہے۔ یہ امداد اسے امریکہ، برطانیہ مغربی جرمنی کی سرکاروں اور یورپ کے کئی ملکوں کے یہودی اداروں کی معرفت ملتی ہے۔ خود اسرائیل کو اس کا اعتراف ہے۔ اس کے مقابلے میں عربوں کو اس کا بیسواں حصہ غیر ملکی امداد بھی نہیں ملی ـــ اسرائیل کی فوجی کامیابی کا اہم ترین راز یہ مدد ہے۔

یہ بھی یاد رہے کہ اسرائیل کی تقریباً ۲۶ لاکھ آبادی میں سے لگ بھگ ۸۰ فی صدی آبادی امریکن اور یوروپین نسل کے سفید فام آبادکاروں کی ہے۔ ان لوگوں کی ٹیکنیکل ٹریننگ کا معیار عربوں کے مقابلے یوں بھی کافی بلند ہے اور پھر جب انہیں غیر ملکی مدد اس قدر دل کھول کر ملی ہو تو پھر ان کی طاقت کا پوچھنا ہی کیا!

اس کے علاوہ یہ بھی نہ بھولنا چاہیئے کہ اسرائیل کو حملے میں پہل کرنے کی سہولت حاصل تھی، اسی سہولت کے سہارے دوسری جنگ عظیم میں "چھوٹے سے" جرمنی نے اتحادیوں کو پانچ سال تک ناکوں چنے چبوائے تھے۔ جو انگریز اور امریکن اس وقت اسرائیل کو شاباشی دیتے پھولے نہیں سماتے وہ شائد بھول گئے ہیں کہ آناً فاناً حملہ کر کے جرمنی اور جاپان نے ان کی کیا گت بنائی

تھی- اتحادیوں کا ڈنکرک کی بندرگاہ پر جرمنوں کے ہاتھوں، امریکنوں کا پرل ہاربر پر جاپان کے ہوائی حملے سے اور انگریزوں کا سنگاپور میں جاپان کے سامنے جو حشر ہوا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ تباہ کن تھا جو اسرائیلی حملہ آوروں کے ہاتھوں عربوں کا ہوا- یاد رہے کہ اسرائیل نے تو اپنے سے ساڑھے تین گنا رقبے پر قبضہ کیا ہے، مگر جرمنی تو اپنے سے سو گنا زیادہ اور جاپان ایک سو دس گنا زیادہ رقبے پر دیکھتے ہی دیکھتے قابض ہو گیا تھا- سچ تو یہ ہے کہ اسرائیل نے میدانی لڑائی لڑی ہی نہیں- اس نے ہر جگہ پر آگ پھیلانے والے نیپام بموں کا استعمال کیا- جو عالمی قانون کے خلاف تھا-

عربوں نے مشکلوں کے باوجود جس جی داری کے ساتھ مقابلہ کیا اس کا ثبوت یہی ہے کہ اکیلے یروشلم ہی میں ۱۵ ہزار اردنی سپاہی بیت المقدس کی حفاظت کرتے ہوئے شہید ہو گئے تھے- اس کے علاوہ یہ حقیقت بھی ہے کہ آخری وقت کی کوششوں کے باوجود مختلف عرب ملکوں میں اچھا فوجی تال میل قائم نہیں ہو سکا- اس کے مقابلے میں اسرائیل کی تیاری برسوں سے تھی اب تو خیر یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ عرب کوئی جوابی تیاری نہ بھی کرتے تو بھی اسرائیل حملہ ضرور کرتا- ظاہر ہے کہ اتنا بڑا حملہ آناً فاناً اور بغیر کسی مدد کے نہیں ہو سکتا تھا- حیرت انگیز اور شرمناک بات یہ ہے کہ یہ مدد اب بھی جاری ہے اسرائیل کے مغربی سرپرستوں کا اصرار ہے کہ اس سے عرب مقبوضہ علاقہ خالی کرنے کو

نہ کہا جائے اور اگر اسے خالی کرنا ہی پڑے تو پہلے اسرائیل کی شرطیں مانی جائیں
مثال کے طور پر عرب بیت المقدس پر اسرائیلی قبضہ مان لیں۔ عرب اسرائیل کے
وجود کو بھی تسلیم کریں۔ عرب اس بات کی بھی گارنٹی دیں کہ نہر سوئز اور خلیج
عقبہ کے استعمال کی اجازت اسرائیل کو ہوگی۔

ظاہر ہے کہ کوئی بھی خود دار اور آزادی پسند ملک ایسی شرطیں نہیں مان
سکتا، عرب ملک اسی لئے وہی کہہ رہے ہیں جس کی مانگ ہندوستان مسلسل
کرتا رہا ہے، یعنی پہلے اسرائیل غصب کئے ہوئے علاقے سے ہٹے اور بعد میں
کسی اور سوال پر بات چیت کی جائے۔

پھیلتی ہوئی "حدیں"

عرب ملکوں پر اسرائیلی حملے کے بعد جو کچھ ہوا وہ اتنی سامنے کی بات ہے کہ اسے دہرانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ مگر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ برطانیہ اور امریکہ کی پُر زور حوصلہ افزائی کے بغیر اسرائیل کو عالمی رائے عامہ کو پاؤں تلے روندنے کی ہمت ہرگز نہ ہوتی۔ برطانیہ اور امریکہ ہی کی بدولت اسرائیل کو موقعہ ملا کہ وہ جنگ بندی کے بعد بھی شام کے بہت بڑے علاقے پر قابض ہو جائے سلامتی کونسل میں امریکی اور برطانوی نمائندوں نے پوری کوشش کی کہ جنگ بندی کے بعد سلامتی کونسل کا اجلاس تیس گھنٹے تک نہ ہونے پائے۔ اسی دوران اسرائیلی فوجوں نے گیلیلی کی پہاڑیوں سے اتر کر شام کے کافی بڑے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ شام ۱۱ رجون کی رات ہی کو جنگ بندی قبول کرنے کا اعلان کر چکا تھا مگر شامی اسرائیلی سرحد پر جنگ بندی کے فیصلے پر ۱۳ رجون کی رات تک عمل نہیں کیا گیا۔ یہی صورت جنگ بندی کے بعد کی ان جارحانہ کارروائیوں کی ہے جو اسرائیل نہر سویز کے علاقے کے آس پاس مسلسل کرتا رہا ہے۔

سامراجیوں کی پوری کوشش ہے کہ اسرائیل سویز کے مغربی کنارے کو بھی ہتھیالے۔

امریکہ اور برطانیہ نے اسرائیل کو جتنی ڈھٹائی کے ساتھ مدد دی ہے اس کا سب سے بڑا ثبوت سلامتی کونسل کی بحثوں میں ملا۔ امریکی اور برطانوی نمائندوں نے نہ صرف انصاف بلکہ امن کے تقاضوں کی دھجیاں بھی اڑا کر رکھ دیں۔ برطانیہ اور امریکہ ہی کی شرارتوں اور سازشوں کی بدولت سلامتی کونسل مفلوج بن کر رہ گئی یہ لوگ ایسا کوئی ریزولیوشن منظور ہی نہ ہونے دیتے تھے جو اسرائیل کو مجبور کرتا کہ وہ حالیہ حملے کے دوران ہتھیائے ہوئے عرب علاقوں کو واپس کردے۔

اس کے بعد جون کے آخر میں جب عام اسمبلی کا ہنگامی اجلاس بلایا گیا تو امریکہ اور برطانیہ کی یہ کوشش کامیاب ہوگئی کہ یوگوسلاویہ اور ہندوستان کی طرف سے پیش کردہ یہ ریزولیوشن دو تہائی اکثریت نہ ہونے پائے اس ریزولیوشن میں کہا گیا تھا کہ اسرائیل ۴ جون سے پہلے کی پوزیشن پر واپس چلا جائے اور اس کے بعد متنازعہ مسئلے طے کئے جائیں۔ اس ریزولیوشن کو اقوام متحدہ کے ممبروں کی اکثریت تو حاصل ہوگئی مگر دو تہائی اکثریت نہیں مل سکی، اس لئے یہ ریزولیوشن اقوام متحدہ کے (عملی فیصلے کی) حیثیت اختیار کرنے سے ناکام رہا ہے۔ ۴ جولائی ہی کو ہنگامی اجلاس نے لاطینی امریکی ملکوں کی طرف سے پیش کیا گیا ریزولیوشن بھی نامنظور کردیا جس میں عرب علاقے خالی کرنے سے پہلے عربوں سے کئی شرطیں

منوانے پر زور دیا گیا۔ یہ ریزولیوشن امریکہ ہی کی درپردہ پشت پناہی اور سرگرم رہنمائی کا نتیجہ تھا۔ گو امریکہ اسے پیش کرنے والوں میں شامل نہیں تھا۔

چور بھی چیتر بھی

اس وقت اسرائیل کی جارحیت ہی کی بدولت یو۔ این۔ او ایک اپاہج ادارہ بن کر رہ گئی ہے۔ لیکن اسی اپاہج اسرائیل نے اپنی توسیع پسند اور عرب دشمن سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اسرائیل کے سامراجی عزائم کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ اسرائیل کی "سرحد" مسلسل پھیلتی ہی جارہی ہے کبھی اسے فلسطین کا ۵۵ فیصدی علاقہ دیا گیا تھا۔ اس نے ۷۷ فی صدی پر قبضہ کرلیا۔ اب اس کے پاس اس سے بھی چار گنا زیادہ رقبہ ہے۔ اسے بھی وہ خالی کرنا نہیں چاہتا۔ حالیہ جنگ کے بعد اس کی علاقائی بھوک جس طرح سے بڑھی ہے وہ ساری دنیا کے سامنے ہے خود اسرائیلی حکمران بڑی ڈھٹائی کے ساتھ اس کا اعتراف کر رہے ہیں۔

مثال کے طور پر امریکہ کے ایک مشہور صحافی جوزف السوپ نے حال ہی میں اسرائیل کا دورہ کیا تھا اور کئی اسرائیلی لیڈروں سے اس نے اسرائیلی حملے کے بعد اسرائیلی سامراج کی توسیع پسندی کی پالیسی سے پیدا ہونے والے مسائل کے بارے میں بات چیت کی۔ اسرائیلی وزیر اعظم لیوی ایشکول نے ایک انٹرویو کے دوران اس سے کہا: "آپ مجھ سے جو کچھ پوچھ رہے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے ملک کو جو خطرے درپیش ہیں وہ ہمیں اپنے قومی

بچاؤ کے نقاصوں کو نظر انداز کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔ بچاؤ کے نقطۂ نظر سے اسرائیل کی سرحد دریائے اردن ہی ہو سکتی ہے۔

(ہیرلڈ ٹربیون پیرس ایڈیشن ۱۳ ستمبر ۱۹۶۷ء)

اس سے چند روز پہلے شرم الشیخ پر قابض اسرائیلی سپاہیوں سے خطاب کرتے ہوئے ایشکول نے کہا تھا کہ اسرائیل کو ہر قیمت پر نہر سویز کو ایک سرحد کے طور پر قائم رکھنا ہو گا کیونکہ اس کے بغیر عرب پڑوسیوں سے وہ اپنا دفاع نہیں کر سکتا۔"

(یروشلم پوسٹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

اسرائیل کو اقوام متحدہ کا کتنا پاس ہے اور اس کے ایشائی افریقی ممبرس کی کتنی قدر ہے اس کا جواب اسرائیلی وزیر خارجہ ابا ایبن نے یروشلم پوسٹ کے ایک نمائندے کو ایک انٹرویو کے دوران دیا، بڑی ہیکڑی سے اس نے کہا کہ اگر عالمی ادارے کے ۱۲۲ ممبروں میں سے ۱۲۱ بھی یہ کہنے لگیں کہ اسرائیل ۵ رجون سے پہلے کی سرحدوں پر واپس چلا جائے تو وہ اس حکم کو ماننے سے الکار کر دیں گے۔"

السوپ نے مذکورہ بالا مضمون ہی کے دوران لکھا ہے کہ اسرائیلی کبھی یہ کہتے تھے کہ انہیں کوئی نیا علاقہ نہیں چاہئے۔ کچھ ہی دن بعد انہوں نے کہا یروشلم کے سوائے وہ کچھ اور نہیں چاہتے۔ پھر وہ کہنے لگے کہ اردن کے مغربی کنارے پر تھوڑے بہت ردّ و بدل کی ضرورت ہے۔ اب وہ یہ کہہ رہے ہیں

کہ آبنائے طیران اور نہر سویز میں جہاز رانی کی گارنٹی سے بھی ان کی تسلی نہیں ہو سکتی ۔ اسی لئے وہ اردن اور سویز کو اپنی سرحدیں بنانا چاہتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ جتنی تیزی سے سرحدوں کے بارے میں اسرائیل نظریہ بدلتا جارہا ہے اس کی انتہا کہاں پر ہوگی ۔"

(ہیرلڈ ٹریبون ۱۳ ار ستمبر ۱۹۶۷ء)

اسی مضمون میں آگے چل کر السوپ نے لکھا ہے کہ اسرائیلی لیڈر اب یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ وہ تازہ مقبوضہ علاقوں کے دس لاکھ عربوں کو برداشت نہیں کر سکتے ۔ ان کے علاوہ تین لاکھ عرب پہلے ہی اسرائیل میں ہیں۔ السوپ کا خیال ہے کہ اسرائیل کی بنیاد چونکہ مذہبی تنگ نظری کے بدترین نظریوں پر ہے اس لئے اس کی کوشش ہوگی کہ وہ جلدی سے جلدی ان عربوں کو وہاں سے نکال دے ۔"

اسرائیلی ماہرین اقتصادیات نے ابھی سے اس کے لئے میدان تیار کرنا شروع کر دیا ہے اسرائیل کے اعداد و شمار کے ادارے کے ڈائریکٹر کا کہنا ہے کہ اگر تمام عرب آبادی اسرائیل ہی کے قبضے میں رہی تو اگلے دس برسوں میں سارے اسرائیل میں عربوں کی اکثریت ہو جائے گی، کیونکہ عربوں میں شرح پیدائش یہودیوں کے مقابلے میں تقریباً ڈیوڑھی ہے ۔ اس وقت عرب آبادی کا تناسب ۴۰ فیصدی ہو گیا ہے اور اس بات کی کوئی امید نظر نہیں آتی کہ نئے امریکی اور یورپین یہودی

آبادکار اتنی بڑی تعداد میں آئیں گے کہ اس خطرہ کا ازالہ ہو سکے۔"

(ہیرلڈ ٹریبون ۹ ستمبر ۱۹۶۷ء)

موشے دایان کو عربوں کو دبائے رکھنے کا مسئلہ خاصا آسان بھی معلوم ہوتا ہے اور سیدھا بھی۔ السوپ سے اس نے ایک بات چیت کے دوران کہا کہ ان علاقوں پر قابو رکھنا ہمارے لئے قطعاً مشکل نہیں ہے۔ ہمیں اس کی پرواہ نہیں ہے کہ عرب آبادی ہمارے ساتھ تعاون کرتی ہے یا نہیں۔ میں مقبوضہ علاقے کے عربوں کو ہمیشہ کہتا ہوں کہ ہمیں انگریزوں کی طرح نہ سمجھنا۔ انگریزوں کو جن قانونی نزاکتوں کی فکر رہتی تھی، ان کی ہم قطعاً پرواہ نہیں کرتے۔ وہ جتنا چاہیں احتجاج کر لیں۔ اپنی دکانیں بند کر لیں اور اسکول بند رکھیں ہم پر اس کا کوئی اثر نہیں ہو سکتا" السوپ نے پوچھا کہ کیا اس طرح سے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے حل ہو سکے گا۔ دایان نے جواب دیا نہیں۔ مگر اس کے بغیر ہمارا عظیم مقصد یعنی امن کا قیام پورا بھی نہیں ہو سکتا۔"

(ہیرلڈ ٹریبون ۱۳ ستمبر ۱۹۶۷ء)

نئی جارحیت

اسرائیلی حکمرانوں نے اپنے شیطانی منصوبے پر عمل بھی شروع کر دیا ہے۔ تل ابیب ہی سے ۲۴ ستمبر کو رائٹر اور دوسرے غیر ملکی نامہ نگاروں نے سرکاری حوالوں سے یہ خبر دی تھی کہ اسرائیلیوں نے شام اور اردن سے ہتھیائے ہوئے

عرب علاقوں کی نئی "سرحدوں" کے ساتھ یہودی بستیاں بسانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسرائیل ان علاقوں کو کسی قیمت پر خالی کرنا نہیں چاہتا، وہ ان پر اسی طرح قابض رہنا چاہتا ہے جس طرح کہ اس نے ۱۹۴۸ء میں اپنے قیام کے بعد ایلات کی بندرگاہ اور ایسے کئی عرب علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا جو اقوام متحدہ کے ریزولیوشن کے مطابق عربوں کو دیئے گئے تھے۔ غزہ کی پٹی میں بھی یہودیوں نے آباد کاری شروع کر دی ہے یہ آبادیاں دراصل فوجی قلعہ بندیاں ہوتی ہیں جن کا بڑا مقصد یہ ہے کہ وہاں پر مستقل طور پر دہشت پسند یہودی آباد کار بیٹھے رہیں تاکہ عربوں کو اپنے حقوق واپس لینے کی ہمت کبھی نہ ہو۔ اس فیصلے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ اب اسرائیل یہ کہہ سکے گا کہ ان علاقوں کو خالی کرنے کا مطلب ہزاروں بلکہ لاکھوں یہودیوں کو تباہ و برباد کرنا ہوگا اور یہ بات وہ کبھی نہیں کر سکتا۔

عین اسی قسم کے "مشینی فارم" اور "کوآپریٹو بستیاں" اسرائیل کی حالیہ لڑائی سے پہلے شام اور اردن کے ایسے کئی علاقوں میں قائم کر چکا تھا جو ۱۹۴۹ء کے جنگ بندی کے معاہدوں کے مطابق یا تو غیر فوجی علاقے قرار دیئے گئے تھے اور ان پر کسی بھی فریق کا اختیار تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور انہیں اسی لئے کھلا چھوڑا گیا تھا کہ مخالف فوجوں کے درمیان مناسب فاصلہ رہے، مگر اسرائیل نے وہاں پر نیم فوجی بستیاں بسا کر باقاعدہ قلعہ بندیاں کر لیں ۔ اقوام متحدہ کے

مصروں کے بار بار احتجاج کے باوجود انہیں اپنے "ملک" کا حصہ قرار دیدیا

اقوام متحدہ کی طرف سے مقرر کئے گئے جنگ بندی کمیشن کے فوجی مبصروں

کے ایک سابق اعلیٰ کمانڈر جنرل (کارل وان ہارن) نے اپنی کتاب امن کا

سپاہی (Soldiering For Peace) میں لکھا ہے کہ اسرائیلیوں کا

عام قاعدہ ہے کہ وہ پہلے کسی سرحدی علاقے میں محض معمولی اور غیر فوجی قسم

کی کوئی سرگرمی شروع کرتے ہیں پھر وہاں پر کاشت شروع کرتے ہیں اور پھر

اس کے گرد فوجی قلعہ بندی کر کے اسے اپنے ملک کا حصہ قرار دیدیتے ہیں"

(صفحہ ۲۷۶) عین یہی حربہ اسرائیل اپنے تازہ ہتھیائے ہوئے علاقوں میں

استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسی فیصلے کا ایک تیسرا پہلو یہ ہے کہ ان علاقوں میں

کوئی بھی زمین بنجر اور غیر آباد نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اس فیصلے کے

باعث ان عربوں کو بہ نوک سنگین عین اسی طرح اپنے گھر بار سے باہر نکال کر

رفیوجی بنایا جائے گا جس طرح کہ دس لاکھ عربوں کو ۱۹۴۸ء میں بنایا گیا تھا۔

عربوں کو ان کے پرانے گھر بار سے نکالنے کی ناپاک مہم کا آغاز اسرائیلی

حملہ آوروں نے بیت المقدس یروشلم ہی سے کیا تھا، یروشلم پر اسرائیلی قبضے

کے بعد اس تمام راستے میں آنے والے مکانات بارود سے اڑا دیئے گئے جو یہودیوں

کے مقدس مقام دیوارِ گریہ اور اسرائیلی مقبوضہ نئے یروشلم کے درمیان حائل تھے

مجھے یاد ہے کہ یہ علاقہ خاصا گنجان آباد تھا اور اسے "صاف" کرتے وقت سینکڑوں

عربوں کو بے گھر بار ہونا پڑا ہوگا۔ یروشلم میں اسرائیلی بربریت کی سب سے شرمناک مثال وہ حملہ ہے جو انہوں نے ہند سرکار کی مدد سے قائم ہندوستانی سرائے پر کیا۔ مسجد اقصیٰ کے قریب واقع اس سرائے میں کبھی دنیا بھر سے آنے والے ہر مذہب کے ملنے والے آکر ٹھہرتے تھے۔ اسرائیلی توپوں نے نہ صرف اس سرائے کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ بلکہ اسے چلانے والے ایک ہندوستانی شہری جناب اے۔ آر۔ صدیقی کے خاندان کے تین افراد ان کے والد، رفیقہ حیات اور ہمشیرہ کو بھی اپنی درندگی کا شکار بنا کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

امریکی اخباروں میں آئے دن یہ خبریں چھپتی رہتی ہیں کہ یہودی یروشلم کے مقدس مقامات کو پکنک سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ مسجدِ اقصیٰ کے صحن کے اندر اسرائیلی سپاہیوں نے شراب تک پینے کے علاوہ اور بھی کئی بدتمیزیاں کیں جس پر مظلوم عربوں اور ان کے درمیان خاصا جھگڑا ہو گیا۔ اخبار اسٹیٹسمین کے نمائندہ جی۔ ایچ جینسن نے اسرائیلی قبضے کے بعد یروشلم کا دورہ کرنے کے بعد اپنے اخبار کی ۲۹ جون کی اشاعت میں لکھا ہے کہ یہودی یروشلم کے مقدس مقامات پر عبادت یا تعظیم کے خیال سے نہیں آتے بلکہ یہودی مذہب کے تمام احکام کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نوجوان عورتیں اور مرد یوں خرمستیاں کرتے رہتے ہیں جیسے وہ کسی عجوبے کو دیکھنے تفریح پر آئے ہوں۔" یہ ہے "مقدس یہودی مقامات" کے لئے اسرائیلی آہ و زاری کا اصلی روپ۔"

اپاہج اقوام متحدہ

اقوام متحدہ کی حالیہ بحثوں سے یہ بھی ظاہر ہے کہ اسرائیل کی جارحانہ کامیابی کے باوجود اس کے پرانے ساتھی یعنی فرانس اور برطانیہ بھی اس کے رویہ سے بیزار نظر آتے ہیں، صدر ڈیگال تو بار بار یہ کہہ چکے ہیں کہ اسرائیل کو اپنی جارحانہ کامیابیوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ ۱۵ جون کو ایک بیان میں انہوں نے عرب اسرائیلی جھگڑے کے بارے میں اپنی سرکار کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ فرانسیسی حکومت یہ سمجھتی ہے کہ کسی بھی ملک کو اس بات کی اجازت ہرگز نہیں ہونی چاہیئے کہ وہ طاقت کے سہارے اپنی سرحدوں میں کوئی تبدیلی کرلے۔

(گارڈین لندن اور مانچسٹر ۲۲ جون ۱۹۶۷ء)

حد تو یہ ہے کہ ہر قسم کی حوصلہ افزائی کے باوجود برطانیہ بھی اسرائیل کی عریاں جارحیت پر خاموش نہیں رہ سکا۔ برطانیہ کے وزیر خارجہ جارج براؤن نے عام اسمبلی سے خطاب کرتے ہوئے منشور کی دفعہ ۲ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ کوئی بھی ریاست قانون ہاتھ میں لے کر کسی بھی بہانے کسی دوسرے ملک کی علاقائی سالمیت کو مجروح کرنے والا کوئی قدم اٹھانے کا حق نہیں رکھتی، آگے چل کر براؤن نے نہایت ہی واضح الفاظ میں اسرائیل کو تنبیہ کی کہ وہ یروشلم کے بارے میں کوئی ایسا قدم اٹھانے سے گریز کرے جس سے منشور کی اس دفعہ

پر حرف آنے کا اندیشہ ہو" میں نہایت سنجیدگی کے ساتھ اسرائیل سرکار سے کہنا چاہتا ہوں کہ اگر انہوں نے پرانے شہر کو اپنی مملکت میں شامل کرنے کی کوشش کی تو اس سے نہ صرف دنیا کی رائے عامہ ان کے خلاف ہو جائے گی بلکہ وہ اپنے دوستوں کی حمایت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

(ہیرلڈ ٹریبون ۲۹ر جون ۱۹۶۷ء)

یہی بات براؤن نے عام اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے ۲۷ر ستمبر کو دہرائی تھی۔ مگر اس کے باوجود "دوستوں" کی حمایت بھی جاری ہے اور اسرائیلی جارحیت کا خونیں ڈرامہ بھی۔

اسرائیلیوں کی اسی توسیع پسندی کے خلاف اقوام متحدہ دو ریزولیوشن بھی منظور کر چکی ہے، لیکن اسرائیل پر عالمی رائے عامہ کی طرف سے کی گئی اس زبردست مذمت کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسرائیلی پارلیمنٹ نے جلدی سے تین نام نہاد قوانین پاس کر دیئے ان میں انضمام کے لفظ کے بجائے دوبارہ اتحاد کا پُرفریب لفظ استعمال کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی بیت المقدس میں صدیوں سے رہنے والے ہزاروں مسلمان اور عیسائی عربوں کو ان کے گھروں سے نکال کر ان کے مکانوں پر سڑکیں بنانے کے لئے بل ڈوزر پھیر دیا گیا۔" حالات اس قدر ناقابل برداشت ہو گئے کہ پوپ پال ششم کو اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل سے ایک اپیل کرنے پر مجبور ہونا پڑا کہ یروشلم کی بین الاقوامی حیثیت کو برقرار رکھا جائے لڑائی

شروع ہونے سے کچھ ہی دن پہلے پوپ نے ایک پیغام میں زور دیا تھا کہ اگر بدقسمتی سے لڑائی ہوئی، حالانکہ ہم تہہ دل سے دعاگو ہیں کہ ایسا نہ ہو تو یروشلم کو ایک کھلا شہر قرار دیا جائے۔ جسے کوئی بھی فریق متنازعہ نہ سمجھے"۔

(گارڈین ۱۶ر جون ۱۹۶۷ء)

لیکن اسرائیلی لیڈروں نے اب ایک نیا ہی نعرہ گھڑ لیا ہے وہ یہ ہے کہ یروشلم اسرائیل ہی کا حصہ ہے۔ بڑی ہیکڑی کے ساتھ وہ کہہ رہے ہیں کہ یروشلم کو اپنا دارالخلافہ بنائے رکھنے کے لئے وہ جنگ تک کرنے کے لئے تیار ہیں ان کی دلیل یہ ہے کہ دو ہزار سال پہلے یروشلم اس زمانہ میں قائم مملکتِ اسرائیل کا دارالحکومت تھا۔ ظاہر ہے کہ اگرچہ یہ دلیل مان لی گئی تو پھر دنیا کا ایک نیا ہی نقشہ بنانا ہوگا جس میں ہر ایسے شہر کو متنازعہ سمجھا جائے گا جس پر کبھی نہ کبھی کسی دوسرے ملک کا قبضہ رہا ہو یا ایک سے زیادہ مذہبوں کے لئے اہمیت رکھتا ہو۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اسرائیل میں موجود کل ۶۵ سفارت خانوں میں سے ۳۳ نے یروشلم کو دارالحکومت کے طور پر قبول نہیں کیا"۔

ہٹلر کے گورو

اسرائیل کے وزیر اعظم نے صاف لفظوں میں یہ اعلان کیا ہے کہ وہ دیوارِ گریہ کے آس پاس کے علاقے کو ڈھا کر وہاں پر حضرت سلیمانؑ کا وہ معبد بنوائیں گے جس کی آخری نشانی یہ دیوار ہی رہ گئی ہے، یاد رہے کہ یہودی راہبوں نے

پرانے معبد سلیمانی کا جو ماڈل بنایا ہے اس میں وہ علاقے بھی آتے ہیں جہاں پر اس وقت مسجدِ اقصیٰ گنبد خضریٰ اور مسجدِ عمرؓ واقع ہے۔ یہی نہیں بلکہ قدامت پسند یہودیوں کا یہ اعتقاد رہا ہے کہ مسجد اقصیٰ کے عین درمیان میں کہیں پر دنیا کا مقدس ترین مقام واقع ہے اسرائیل کا ہر رہنما بار بار قسم کھا چکا ہے کہ وہ اس مقدس مقام کی عظمت کو بحال کر کے رہے گا۔ اسرائیلی دعووں کے مطابق یہ "عظمت" مسجد اقصیٰ کو مسمار کئے بغیر بحال نہیں ہو سکتی۔

جناب ظفر پیامی نے اپنے ایک مضمون "(بانو اگست ۱۹۶۷ء) میں عربوں پر اسرائیلی مظالم کی تفصیلی داستان یوں بیان کی ہے۔

"اسرائیلیوں نے یہ کام یروشلم پر قبضے کے ساتھ ہی شروع کر دیا تھا۔ اخبار لندن ٹائمز کے نامہ نگار کے مطابق اسرائیلی قبضے کے تین گھنٹے بعد ہی اس سارے علاقے کے عربوں کو اپنے گھروں سے نکلنے کا حکم دے دیا گیا۔ جن کے گھر مسجدِ اقصیٰ اور یہودی یروشلم (۱۹۴۸ء میں اسرائیل نے حملہ کر کے یروشلم کے بیرونی حصے پر قبضہ کر لیا تھا حالانکہ اقوام متحدہ نے اس کی بھی مناہی کی تھی) کے درمیان آتے تھے ان مکانوں کو ڈائنامیٹ سے اڑا کر اب ہموار کر دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ ہزاروں عربوں کو یہ کہہ کر گھروں سے باہر پھینک دیا گیا ہے کہ ان کے مکان ۱۹۴۸ء سے پہلے یہودیوں کے تھے۔ اپنی اس درندگی کے دوران عورتوں اور بچوں کو اسرائیلی حملہ آوروں نے خاص طور پر نشانہ بنایا، امریکی رسالہ نیوزویک

(۱۷ر جون ۱۹۶۷ء) کے اسرائیلی نامہ نگار سے کے ایک خبر نامہ میں بتایا گیا ہے کہ نامہ نگار اپنے ایک امریکی ساتھی صحافی کی لاش حاصل کرنے یروشلم کے بڑے ہسپتال میں گیا، یہ نامہ نگار لڑائی کے دوران اتفاقیہ مارا گیا تھا۔ وہاں پر جو منظر اس نے دیکھا وہ اس نے اس طرح بیان کیا ہے "عیسائی مشنریوں کے اس ہسپتال میں یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ انسان زیادہ ہیں یا مکھیاں۔ بستروں پر ہی کیا منحصر برآمدے کے فرش تک زخمیوں سے بھرے ہوئے تھے ان میں زیادہ تر غیر فوجی تھے ان سب کو آگ لگانے والے نیپام بم کے زخم آئے تھے، مردہ خانے میں لاشیں یوں پٹی پڑی تھیں جیسے سات منزلہ مکان کا ملبہ ہو۔ ہسپتال کے انچارج نے جو ایک امریکی راہب تھا، مجھے بتایا کہ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ مرنے والوں کے چند آخری لمحے نسبتاً آسان بنا دیں ورنہ یہ سب مر جائیں گے، وہیں پر میں نے ایک نوجوان لڑکی کو دیکھا جس کے گلے میں صلیب تھی اور جو چار عرب بچوں کے اوپر "پر" پھیلائے یوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے ایک فاختہ چیلوں سے اپنے بچوں کی حفاظت کر رہی ہو۔ ہسپتال کے انچارج نے بتایا کہ یہ اندھی لڑکی ایک مقامی راہبہ تھی اور بچے ایک مقامی اسکول کے طالب علم۔ سب ہی عین یہیں پر اسرائیلی بموں کے شکار ہوئے تھے۔"

اسرائیل نے جس اردنی علاقے پر قبضہ کیا تھا اس میں تقریباً بارہ لاکھ عرب آبادی ہے۔ اسرائیل کی اپنی یہودی آبادی ہے صرف بیس لاکھ اور عرب آبادی ہے ۳ لاکھ، گویا اگر یہ عرب آبادی بھی اسے مل جائے تو "نئے اسرائیل" کی

عرب آبادی پندرہ لاکھ ہو جائے گی۔ جسے اسرائیل کے حکمران ایک خطرناک تناسب سمجھتے ہیں، اس لئے ان کی کوشش ہے کہ زیادہ سے زیادہ عربوں کو وہاں سے نکال کر یہودیوں کو بسا دیا جائے۔

اس کے لئے ہر طرح کے حیلوں، بہانوں اور مظالم کا سہارا لیا جا رہا ہے مثال کے طور پر اسرائیلی قبضے کے فوراً بعد انہوں نے پچاس ہزار آبادی والے ایک خوبصورت قصبے قلقلیہ کو توپوں اور ڈائنامیٹ سے یہ کہہ کر اڑا دیا کہ وہاں کبھی اردنی توپ خانہ تھا۔ ڈھٹائی کی حد یہ ہے کہ اپنے اس جرم سے اسرائیل نے کبھی انکار نہیں کیا۔

اس پر دنیا کے سب سے عظیم انگریز مورخ پروفیسر ٹائمبی کا یہ حالیہ قول یاد آتا ہے کہ "یہودیوں کو کبھی ہٹلر نے اپنی درندگی کا نشانہ بنایا تھا، مگر عجب ستم یہ ہے کہ وہ اس کا بدلہ ان عربوں سے لے رہے ہیں جنہوں نے انہیں ہمیشہ باعزت طور پر رکھا ہے۔ عرب دنیا میں یہودیوں سے کبھی برا سلوک نہیں ہوا۔ لیکن یہودیوں نے عربوں پر ایسے مظالم توڑے ہیں جن کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی، ان کے سامنے وہ ظلم بھی "انسانیت" معلوم ہوتا ہے جو ہٹلر نے یہودیوں پر کیا۔"

ان ہی مظالم کی ایک داستان اسرائیلی مقبوضہ اردن کے شہر نابلس کے ایک اسکول کی طالبہ کلثوم خلیلی نے بیان کی ہے، وہ کہتی ہے ہمارا اسکول ایک

بورڈنگ اسکول تھا، جب سے لڑائی چھڑی ہم لوگ اپنی استانیوں کے ساتھ اسکول کے ساتھ جلدی سے کھودی گئی خندق ہی میں رہیں، وہاں ڈھائی دن گذارنے کے بعد جب باہر نکلیں تو دیکھا کہ اسکول کی عمارت اینٹوں کے ڈھیر میں بدل چکی تھی اور اسرائیلی فوجی افسر ہماری ہیڈ مسٹریس کے سامنے سنگین لئے کھڑے تھے کہ اپنی لڑکیوں کو ان کے حوالے کردے عین اسی وقت چند غیر ملکی اخباری نمائندے ادھر آنکلے انہیں دیکھ کر ان ظالموں کا رویہ قدرے نرم ہو گیا، انہوں نے ہم سب کو پروگرام کے مطابق قتل کرنے یا اپاہج بنانے کے بجائے (جیساکہ وہ دوسرے اسکولوں میں کرچکے تھے) فوجی ٹرکوں میں بھر کر اردن میں "پھینکنے" کا حکم دیدیا، ہم تینتیس ۳۳ لڑکیاں تھیں، جب ہم یہاں (عمان) پہنچیں تو پتہ چلا کہ تین کو چھوڑ کر باقی سب کی سب یتیم ہو چکی ہیں۔

اردن میں ہر روز داخل ہونے والے یہ یتیم بچے، بیوہ عورتیں اور لاغر مرد ہر اعتبار سے بے آسرا ہیں۔ جلدی جلدی ان کے لئے خیمے لگائے جارہے ہیں، لیکن اردن کی حکومت اپنے طور پر نہ ان کی خوراک کا بندوبست کرسکتی ہے اور نہ رہائش کا جس ملک کے رقبے کا تقریباً آدھا حصہ، ۶۶ فی صدی اور آبادی پر غیر ملکی قبضہ ہو جائے وہ کر ہی کیا سکتا ہے، اقوام متحدہ اپنے لاڈلے اسرائیل کی خرمستیوں کے کانوں پر ان بدنصیب شکاروں کے برے حال کو دیکھ کر جوں تک نہیں رینگی۔

یہی حال متحدہ عرب جمہوریہ کی طرف آنے والے مہاجروں کا ہے یہاں کا مسئلہ اتنا شدید نہیں ہے کیونکہ سینائی کا صحرا خاصا غیر آباد تھا، لیکن فلسطین

کے ساتھ لگنے والے چھوٹے سے علاقے غزہ میں رہنے والے تین لاکھ مہاجروں پر کیا بیتی ہے، اسے نہ قلم لکھ سکتا ہے اور نہ کان سن سکتے ہیں۔

غزہ کی یہ پٹی مرحوم فلسطین کا حصہ تھا جس کا نظم و نسق اب مصر کے پاس تھا۔ یہاں پر تقریباً پچاس ہزار مقامی لوگ اور ڈھائی لاکھ وہ مہاجر آباد تھے جو ۱۹۴۸ء میں اسرائیل سے نکالے گئے تھے، یہ لوگ اقوام متحدہ کی طرف سے بنائے گئے کیمپوں میں رہ کر زندگی کے دن کاٹ رہے تھے، انہی کے پاس اقوام متحدہ کی ہنگامی فوج کے ہندوستانی دستے کا کیمپ تھا، اسی کیمپ کو اسرائیلی حملہ آوروں نے ان کے بزدلانہ اور وحشیانہ حملے کا شکار بنا کر ہمارے تین بہادر جوانوں اور ایک نوجوان فوجی افسر کو شہید کر دیا گیا تھا۔ جن جلادوں نے اقوام متحدہ کی فوجوں کو معاف نہیں کیا، انہوں نے عربوں کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا ہوگا؟ سب سے پہلے انہوں نے غزہ کو پانی سے محروم کر دیا۔ "جنہیں پانی کی پیاس ہے وہ جا کر ناصر سے مانگیں" اس کے ساتھ ہی سینکڑوں نوجوانوں کو توڑ پھوڑ اور دشمنانہ کارروائیوں کے الزام میں پکڑ کر سر بازار گولی مار دی گئی ساری عرب دنیا کو خوفزدہ کرنے کے لئے اسرائیل کی یہ چال بھی تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگ عرب علاقوں میں پہنچ کر اسرائیلی مظالم کی خوفزدہ کہانیاں بیان کریں تاکہ آزادی کے لئے تڑپتے ہوئے عرب عوام پر اسرائیلی درندوں کا رعب بیٹھ جائے۔

اسی چال کے تحت غزہ کے ہزاروں شہریوں کو موت کی دھمکی دے کر گھروں سے نکال دیا گیا۔ صحرا کی تپتی ہوئی دھوپ میں سینکڑوں معصوم بچوں بے سہارا عورتوں اور لاغر بوڑھوں نے پانی کی ایک بوند تک لئے بغیر سینائی کے صحرا میں دم توڑ دیا، سینائی کے اسی راستے سے کبھی حضرت مریم بھی امن کے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے درد زہ میں مبتلا بھوکی، پیاسی گزری تھیں۔ تاریخ بڑے ظالم طریقے سے اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔

اسرائیلی درندوں کی ایک خاص پالیسی یہ رہی ہے کہ بچوں کو اپاہج تو کر دیا جائے لیکن حتی الامکان قتل نہ کیا جائے، ایک اسرائیلی نامہ نگار نے اس کی عجیب وغریب وجہ بیان کی ہے اس کا کہنا ہے کہ اسرائیلی درندے یہ سمجھتے ہیں کہ ان بچوں کو چونکہ بڑوں کی نسبت زیادہ دیر تک زندہ رہنا ہے لہٰذا بہتر ہے کہ وہ زندہ رہیں تاکہ سالہا سال تک عربوں کو عبرت کا سبق دیتے رہیں۔"

تازہ جرائم

عربوں پر حالیہ حملے کے بعد اسرائیل کے بہیمانہ مظالم میں کئی گنا اضافہ ہو چکا ہے۔ ۲۴ر ستمبر ۱۹۶۷ء ہی کو تل ابیب سے شائع شدہ ایک سرکاری اعلان میں بتایا گیا تھا کہ مقبوضہ اردن کے شہر نابلس کے چار مکانات کو اس شبہ پر ڈائنامیٹ سے اڑا دیا گیا ہے کہ وہاں پر عرب دہشت پسند چھپے ہوئے تھے۔

اسرائیل کے وزیر جنگ موشے دایان نے ۲۰ ستمبر کو تل ابیب میں اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ تمام "سرحدی" علاقوں میں دہشت پسندوں کا زور اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ان علاقوں کو عربوں سے خالی کروانے کے سوائے کوئی چارہ ہی نہیں رہا۔ اسرائیلی سرکار ہی کے حکم سے رام اللہ، قدیم یروشلم اور کئی دوسرے مقامات پر دہشت پھیلانے کا جو طریقہ اپنایا گیا اس نے تو یہودیوں پر ڈھائے گئے ہٹلرانہ مظالم کو بھی مات کر دیا ہے ان میں سے ایک "محبوب" طریقہ یہ ہے کہ مکانوں میں بجلی کا کرنٹ دوڑا دیا جاتا ہے تاکہ اسے چھونے کے خوف سے ڈر کر مکانوں کے باسی انہیں چھوڑ کر بھاگ جائیں۔

اسرائیلی حکمران ایسی تمام حرکتوں کا سہارا اس لئے لے رہے ہیں کہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اُن کے مقبوضہ علاقوں کے عرب عوام ان کی غلامی برداشت نہیں کریں گے اسرائیلی غاصبوں کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ مقبوضہ علاقوں کے عربوں کی اکثریت اسرائیل کے ان گنت مظالم کے باوجود اپنے گھر بار چھوڑ کر بھاگی نہیں۔ گویا جس طرح سے ۱۹۴۸ء میں صیہونی دہشت پسندوں نے فلسطین کے بڑے حصوں کو عربوں سے خالی کروالیا تھا، ویسا وہ اب نہیں کروا سکتے یہ مقامی عرب اسرائیل میں رہنے والے عربوں کے ساتھ مل کر اپنی تحریک آزادی کو تیز کر رہے ہیں۔ اسرائیلی اسی تحریک آزادی کو کچلنے کے لئے تین حربوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ پہلا تو یہ ہے کہ اسرائیل سرکار نے اپنے مقبوضہ علاقوں

سے بھاگنے والے عربوں کو واپس آنے کی مناہی کر دی ہے یاد رہے کہ حملے کے فوراً بعد اسرائیل سرکار نے اوتھانٹ سے یہ باقاعدہ وعدہ کیا تھا کہ حالیہ حملے کے دوران جو لوگ بھی اپنے گھروں کو چھوڑ کر دوسری طرف گئے ہیں انہیں واپس آنے کی پوری آزادی حاصل ہوگی۔ مگر اسرائیلی حملہ آوروں نے سات ہزار سے زائد عربوں کو واپس آنے کی اجازت نہیں دی۔ ان میں بھی اکثریت بچوں، عورتوں اور بوڑھوں ہی کی تھی جنہیں اسرائیلی پراپیگنڈہ نمائشی مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اسرائیل سرکار کے اپنے اندازے (۲۷ر جولائی ۱۹۶۷ء) کے مطابق تقریباً تین لاکھ مزید عرب حالیہ حملے کی بدولت بے گھر ہوئے ہیں۔

لامثال رعونت

اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں فلسطین سے نکالے گئے عرب مہاجرین کو کام اور امداد مہیا کرنے کا جو ادارہ (U N RWA) بنایا تھا اس کے امریکی ڈائریکٹر ڈاکٹر ڈیوس نے ۱۹۶۲ء میں اپنی رپورٹ میں یہ تخمینہ بھی لگایا تھا کہ فلسطین میں اسرائیلی قبضے کے بعد عرب املاک کی قیمت اتنی زیادہ ہے کہ ان سے ہر سال کم از کم ایک کروڑ چالیس لاکھ ڈالر کی آمدنی ہونی چاہیئے انہوں نے اسی لئے سفارش کی تھی کہ ان جائیدادوں کی نگرانی کے لئے ایک نگران مقرر کر دیا جائے۔ ڈاکٹر ڈیوس کا خیال تھا کہ اگر عرب مہاجرین کو اپنی جائیدادوں کی آمدنی ملنی شروع ہو جائے تو پھر انہیں ۳۵ لاکھ ڈالر کی اس امداد کی معمولی

سی بھی ضرورت نہیں رہے گی جو اقوام متحدہ کے ادارے کا سالانہ بجٹ ہے اور جسے ہر سال منظور کرتے وقت امریکہ اور دوسرے ملک عرب مہاجرین کو سو طرح کے طعنے سناتے ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں اگر ان املاک کی آمدنی کا اندازہ ایک کروڑ ۴۰ لاکھ ڈالر تھا تو موجودہ قیمتوں کے اعتبار سے وہ یقیناً دو کروڑ ڈالر ہوگا۔ اب تو خیر صیہونیوں کے مال غنیمت میں اس کروڑوں ڈالر کی جائیداد کا بھی اضافہ ہو گیا ہے جو انہیں حالیہ حملے کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔

اس تمام صورتحال کو نہ تو عرب عوام خاموشی سے دیکھ سکتے ہیں اور نہ ہی عرب حکومتیں۔ اس پر طرہ یہ ہے کہ اسرائیلی حکمرانوں نے انتہائی ڈھٹائی کے ساتھ یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وہ ۴ جون ۱۹۶۷ء کی پوزیشن پر واپس جانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں رکھتے۔ اسرائیلی وزیر اعظم لیوی اشکول نے ۱۷ ستمبر کو سوئز کے مشرقی ساحل کے کنارے کا دورہ کرتے ہوئے لامثال بے حیائی کے ساتھ غیر ملکی نامہ نگاروں کے سامنے بڑ ہانکی تھی کہ اسرائیل کی قدرتی سرحد مصر کے ساتھ نہر سوئز ہی ہو سکتی ہے اور اردن کے ساتھ دریائے اردن، یہی اشکول صاحب ۱۵ جون تک یہ کہہ رہے تھے کہ وہ ایک انچ عرب علاقے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔ ۵ جون سے پہلے ان ہی حضرت نے بار بار کہا تھا کہ اسرائیل کو کوئی علاقائی ہوس نہیں ہے وہ صرف اپنی سرحدوں کی حفاظت چاہتا ہے۔ اب یہی "سرحدیں" ۴ جون سے پہلے کے اسرائیل

نئے مقابلے میں تین گنا اور اقوام متحدہ کے تقسیم کے منصوبے کے مطابق بنائے جانے والے اسرائیل کے مقابلے میں چار گنا بڑے علاقے کی "سرحدیں" بن گئی ہیں۔ اسرائیلی وزیر جنگ موشے دایان نے ۲۳ ستمبر کو کئی غیر ملکی نامہ نگاروں کے سامنے بڑی رعونت سے کہا تھا کہ اسرائیل کی "سرحدیں" اب پہلے کی نسبت کہیں زیادہ "آسان" اور "آرام دہ" ہو گئی ہیں، ہم سوئز سے چند گھنٹوں میں دمشق اور اردن کے مغربی کنارے سے آگے بڑھ کر اتنی ہی جلدی عمان پہونچ سکتے ہیں۔" ہٹلر نے کبھی اپنی جارحیت کے بدترین دور میں بھی اس قدر ڈھٹائی کے ساتھ کبھی بات نہیں کی۔ لیکن "امن" و "انصاف" کے امریکی اور انگریز علمبرداروں اور ان کے پٹھوؤں کو اس جارحیت کا کھلے بندوں بیٹھ ٹھونکتے ہوئے معمولی سی بھی شرم نہیں آتی۔ صاف نظر آتا ہے کہ اس دھاندلی کے خلاف جب عرب کوئی عملی قدم اٹھانے کی سوچیں گے تو اسرائیل کی طرف سے اسے جارحانہ اقدام قرار دیا جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ پھر اسی بہانے عربوں پر نئی یورش کر دی جائے اور کہا جائے کہ اسرائیل نے جو کچھ کیا ہے اپنی حفاظت کے لئے کیا ہے۔ اسرائیلیوں کے عزائم کیا ہیں اس کا سب سے واضح ثبوت وہ کتبہ ہے جو اسرائیلی پارلیمنٹ کی بلڈنگ کے صدر دروازے کے اوپر لگا ہے اس میں کہا گیا ہے کہ اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے لے کر فرات تک ہیں۔

آج کے دور میں دنیا کے کسی ملک کو اتنی ڈھٹائی کے ساتھ اپنے جارحانہ

عزائم کی تشہیر کی ہمت نہیں ہوئی۔ اسرائیل کے یہی جارحانہ ارادے اور اقوامِ متحدہ کی اس معاملے میں بے بسی ہی شائد اس بات کی ذمہ دار ہوگی کہ کچھ دیر بعد مشرقِ وسطیٰ میں شائد ایک بار پھر جنگ کا جوالا مکھی بھڑک اٹھے اور اس کی لپیٹ میں سارا مغربی ایشیا ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کا امن آجائے۔

رحمت اور زحمت

مغربی ملک اسرائیل کی پشت پناہی کیوں کر رہے ہیں اس کی کئی وجہیں ہیں لیکن سب سے اہم وجہیں دو ہیں، ایک جغرافیائی اور دوسری اقتصادی جغرافیائی اعتبار سے اسرائیل کا مقبوضہ علاقہ سارے وسط مشرق پر تسلط رکھنے کے لئے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اقتصادی وجہ تیل کی دولت ہے جس نے عرب ملکوں کو اس قدر مالا مال کر رکھا ہے جس کی مثال دنیا کے کسی اور خطے میں نہیں ملتی، عربوں کے اس پگھلے سونے پر ہمیشہ سامراجیوں کی للچائی نظریں لگی رہتی ہیں اور دراصل آج متحدہ عرب جمہوریہ اور الجزائر کے علاوہ باقی عرب ملکوں سے نکلنے والے تیل پر سات مغربی اجارہ دار کمپنیوں کا مکمل قبضہ ہے جن میں پانچ امریکی اور دو برطانوی کمپنیاں ہیں۔

عرب ملکوں میں تیل کا پتہ آج سے ٹھیک ساٹھ برس قبل لگا تھا۔ بھولے بھالے عربوں کو اس وقت یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کے وطن کے اندر کتنی قیمتی دولت محفوظ ہے اور سامراجیوں نے اس طرح اس کا سودا کر لیا

جس طرح کوئی جوہری کسی اناڑی سے ہیرے کو پتھر کے دام ادا کر کے ٹھگ لیتا ہے۔ اور جب عربوں کو اس کا احساس ہوا اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی چالیس سال قبل عرب ملکوں سے سالانہ صرف پچاس لاکھ ٹن تیل نکلتا تھا۔ اور آج تو عرب ملکوں کی مجموعی سالانہ پیداوار ۸۴ کروڑ ٹن ہو چکی ہے مشرقی وسطیٰ میں نکلنے والا تیل پوری سرمایہ دار دنیا کا ۶۰ فی صدی ہوتا ہے مغربی یورپ میں استعمال کئے جانے والے تیل کا تین چوتھائی حصہ اسی خطے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ امریکہ کی پانچ کمپنیوں میں سے تین کا تعلق راک فیلر گروپ سے ہے جس کا جال ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ عرب ملکوں پر پہلے برطانیہ کا قبضہ تھا اور اب اس کی جگہ امریکہ لیتا جا رہا ہے تیل کی یہ دولت عربوں کے لئے بجائے مسرت و شادمانی کے بار بار مصائب و آلام لاتی ہے اور انہیں بین الاقوامی لیٹروں کے ظلم و ستم کا شکار بناتی ہے۔ ماضی کی پوری تاریخ ایسی ہی خون چکاں داستانوں سے بھری پڑی ہے اور حالیہ اسرائیلی جارحیت بھی اسی سلسلے کی ایک دردناک کڑی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ عرب ملکوں کے تیل سے حاصل ہونے والے منافع کا نصف حصہ عربوں کو ملتا ہے لیکن دراصل ایسا نہیں ہوتا بلکہ مختلف بندر بانٹ کے طریقے اپنا کر بیرونی اجارہ دار کمپنیاں ہر طرح کی بے ایمانی اور چوری کے ذریعے عربوں کا حصہ ہڑپ کر لیتی ہیں۔

ماہرین کے ایک تخمینے کے مطابق بیرونی اجارہ دار کمپنیاں منافع کا صرف ایک تہائی مقامی حکومتوں کو ادا کرتی ہیں اور دو تہائی خود لے جاتی ہیں اس کے علاوہ مشرق وسطیٰ میں تیل نکالنے کے اخراجات امریکہ کے اخراجات کا صرف نصف فی صدی ہیں لیکن عالمی منڈی میں ان کی فروخت کی قیمت یکساں ہے۔ چنانچہ مشرق وسطیٰ میں تیل نکالنے پر جو سرمایہ کاری کی جاتی ہے۔ اس کا منافع ڈیڑھ سال کے اندر ہی حاصل ہونے لگتا ہے جبکہ امریکہ میں سرمایہ کاری کے بعد کہیں دس سال پر منافع آنا شروع ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک ایسا ذریعۂ آمدنی ہے جسے سامراجی ترک کرنے کو کسی حال میں آمادہ نہیں ہو سکتے۔ تاوقتیکہ انہیں گردن پکڑ کر عرب ملکوں سے نکال باہر نہ کیا جائے؛ عرب قوم پرستی کی تحریک کا اوّلین مقصد یہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ سامراجی طاقتیں کسی قیمت پر مشرق وسطیٰ کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتیں اور اس معاملے میں عرب قوم پرستی کی تحریک کو کچلنے کے لئے وسیع پیمانے پر سازشوں کا جال بچھا رہی ہیں، اور عرب قوم پرستی کے اس خطرے کو بھانپ کر ہی سامراجیوں نے اس خطے میں اسرائیل کو اپنا پٹھو منتخب کیا ہے۔ سامراجیوں کا خیال ہے کہ اسرائیلی توسیع پسندی کی بدولت عرب دنیا کے تیل پر بھی مغربی قبضہ قائم رہ سکتا ہے، عرب ملک اپنے پیروں پر بھی کھڑے نہیں رہ سکتے اور سامراجی فوجی مصلحتیں بھی پوری ہوتی رہیں گی۔

مجرم بھی محتسب بھی

اسرائیل کے ڈھنڈورچی ایک رونا ہمیشہ روتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ اسرائیل یو۔این۔او نے بنایا تھا اور اس لئے جو عرب ملک اسے نہیں مانتے وہ یو۔این۔او کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں اس کے ساتھ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان اسرائیل سے سفارتی رشتے قائم نہ کرکے یو۔این۔او کی بے عزتی کر رہا ہے۔

سچائی یہ ہے کہ یہ دونوں دلیلیں بالکل لغو بھی ہیں اور بے بنیاد بھی، یاد رکھنے کی پہلی بات تو یہ ہے کہ جس اسرائیل کو اقوام متحدہ نے بنانے کی اجازت دی تھی اس میں اور موجودہ اسرائیل میں بے حد فرق ہے۔ یو۔این۔او کے ۲۹ر نومبر ۱۹۴۷ء کے ریزولیوشن کے مطابق (ہندوستان اور سب ہی آزاد ایشیائی ملکوں نے اس کی مخالفت کی تھی) اسرائیل کو فلسطین کے تقریباً ۵۵ فی صدی حصے ہی پر اپنی حکومت قائم کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ یہ بھی طے ہوا تھا کہ یروشلم کا مقدس شہر عالمی نگرانی میں دیا جائے گا اور فلسطین

کا تقریباً ۴۵ فی صدی حصہ عربوں کے پاس رہے گا،

اسرائیل نے اس ریزولیوشن پر "عمل" یوں کیا کہ ۱۵ مئی ۱۹۴۸ء کو وجود میں آنے سے پہلے ہی فلسطین کے ۷۷ فی صدی حصے پر قبضہ کر لیا اس میں یروشلم کے شہر کا ایک بڑا حصہ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد ۷ دسمبر ۱۹۴۹ء کو اسرائیل نے اپنی پارلیمنٹ کو نئے یروشلم میں منتقل کر دیا۔ اس پر اقوام متحدہ کی عام اسمبلی نے ۹ دسمبر ۱۹۴۹ء کو اس بنا پر اسرائیل کی مذمت کا ایک ریزولیوشن منظور کیا۔ یو۔ این۔ او کی ٹرسٹی شپ کونسل نے ۲۰ دسمبر ۱۹۴۹ء کو سخت ترین الفاظ میں اس اقدام کی مذمت کی، لیکن یو۔ این۔ او کی ناپاک تخلیق اسرائیل کے وزیر اعظم بن گورین نے ان ریزولیوشنوں کو "مردہ اور فرسودہ" کہہ کر ٹھکرا دیا۔

(یروشلم پوسٹ ۲۲ دسمبر ۱۹۴۹ء)

۱۱ مئی ۱۹۴۹ء کو یو۔ این۔ او کا ممبر بناتے وقت یہ بات ریزولیوشن میں درج تھی کہ اسرائیل فلسطین کے بارے میں یو۔ این۔ او کے سب ہی ریزولیوشن مانے گا اور اسی شرط پر اسے ممبر بنایا گیا تھا۔ اس وقت تک یہ ریزولیوشن صرف دو تھے ایک تو یہ۔۔ کہ اسرائیل ان تمام عربوں کو واپس اپنے گھروں میں آنے کی اجازت دے جنہیں اس نے مار پیٹ کر نکال دیا تھا دوسرا یہ کہ اسرائیل وہ تمام علاقہ خالی کر دے جسے یو۔ این۔ او کے فیصلے

کے مطابق اس کی تحویل میں نہیں دیا گیا تھا، اسرائیل سرکار نے باقاعدہ وعدہ کیا تھا کہ عالمی برادری کا رکن بننے کے بعد وہ ان پر عمل کرے گا، مگر اس نے "عمل" یوں کیا کہ دو لاکھ مزید عربوں کو ان کے گھروں سے نکال دیا اور مزید عرب علاقے پر قبضہ کر لیا۔ حالیہ جنگ چھڑنے تک اسرائیل پرانے ملک فلسطین کے تقریباً ۸۰ فی صدی حصے پر قبضہ کر چکا تھا، حالانکہ یو۔ این۔ او نے اسے صرف ۵۵ فیصدی کا حق دار بنایا تھا۔

اسرائیل نے کیسے اپنی "حدود" کو بڑھایا۔ ہے اس کا اندازہ صفحہ ۱۲۸ پر دیئے گئے تین نقشوں سے ہو جائے گا۔ اسرائیلی دھاندلی کی سب سے تازہ مثال یہ ہے کہ یو۔ این۔ او کی عام اسمبلی اسی سال جولائی ۱۹۶۷ء میں دو بار بہت ہی صاف اکثریت کے ساتھ ریزولیوشن پاس کر چکی ہے کہ یروشلم کو اسرائیل اپنی قلمرو میں نہ ملائے مگر ہر اسرائیلی لیڈر خم ٹھونک کر یہ کہہ رہا ہے کہ یو۔ این۔ او جائے بھاڑ میں وہ یروشلم کے اس پرانے شہر کو کبھی نہیں چھوڑے گا جس پر اسرائیلیوں نے حال ہی میں قبضہ کیا تھا۔

جس بے دردی کے ساتھ اسرائیل نے یو۔ این۔ او کے ہندوستانی دستے کے فوجیوں کو قتل کیا اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اسرائیل کی نظروں میں یو۔ این۔ او یا اس کے سپاہیوں کی رتی بھر بھی نہ عزت ہے اور نہ وقعت۔ اس سے پہلے اقوام متحدہ ہی کے ثالث شہزادہ برنا ڈوٹ کو ۱۹۴۸ء میں

ایسی ہی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا تھا، اس پر اسرائیل کی مذمت کا سلامتی کونسل کا ریزولیوشن (۱۸ر ستمبر ۱۹۴۸ء) بھی موجود ہے۔ اس ریزولیوشن میں اظہار افسوس کیا گیا تھا کہ بار بار توجہ دلانے اور مسلسل وعدے کرنے کے باوجود اسرائیل سرکار نے کاؤنٹ کے قاتلوں کی گرفتاری کے لئے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔"

اسرائیل ہی اب تک عرب رفیوجیوں کے بارے میں یو۔این۔او کے بارہ[12] ریزولیوشنوں کو ٹھکرا چکا ہے۔ اسرائیل ہی کے خلاف یو۔این۔او کی سیکورٹی کونسل نے سات بار اور عام اسمبلی نے ۲۷ بار پچھلے بیس[20] برسوں میں ریزولیوشن منظور کئے ہیں مگر ایک بار بھی اسرائیل کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔

سب سے بڑا مجرم

جو لوگ عربوں کو یہود دشمنی کا الزام دیتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں سیکورٹی کونسل نے سات بار اور یو۔این۔او کے دوسرے اداروں نے سترہ مرتبہ اسرائیل کے حملوں اور جارحانہ کارروائیوں کی مذمت کے ریزولیوشن پاس کئے ہیں وہاں عربوں کے خلاف ایک بھی ریزولیوشن موجود نہیں ہے یاد رہے کہ سلامتی کونسل میں اسرائیل کے دو اہم حمائتیوں امریکہ اور برطانیہ کو ویٹو کا حق حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ریزولیوشن اسی وقت منظور کئے گئے جبکہ اسرائیل کی امن دشمن کارروائیاں اس حد تک بڑھ گئیں کہ امریکہ اور برطانیہ کو بھی اپنے پٹھو کی مذمت پر مجبور ہونا پڑا، دنیا کا کوئی بھی ملک ایسا نہیں

ہے جس کی مذمت یو۔ این۔ او نے اتنی بار اور اتنی زیادہ کی ہو، حیرت ہے کہ وہی اسرائیل یو۔ این۔ او کے نام کو اپنے مخالفوں کے خلاف استعمال کرنا چاہتا ہے، اسے کہتے ہیں پہلے چوری پھر سینہ زوری۔ اسی اسرائیل کے حامی یہ کہنے سے نہیں ہچکچاتے کہ اسرائیل کی "حق تلفی" کر کے عرب اقوام متحدہ کو جھٹلا رہے ہیں۔ عربوں کی سیدھی سادی دلیل یہ ہے کہ ان سے اسرائیل کے "حق" منوانے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اسرائیل کو یو۔ این۔ او کے فیصلوں اور عالمی رائے عام کا پابند بنایا جائے۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ حالیہ حملے کے دوران جن چار لاکھ سے زیادہ عربوں کو اسرائیل نے بے گھر بنایا ہے ان میں سے بھی چند ہزار سے زیادہ کو اس نے واپس آنے کی اجازت نہیں دی، اسرائیل کا یہ اقدام بھی یو۔ این او کے احکام کی مکمل خلاف ورزی ہے۔ مگر اسرائیل نے صرف یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ اس کے ہاں اتنی جگہ ہی نہیں ہے کہ وہ ان پندرہ لاکھ نئے اور پرانے عرب شرنارتھیوں کو اپنے گھروں میں واپس آنے کی اجازت دے، اس کے ساتھ ہی اسرائیل کروڑوں روپے خرچ کر کے دنیا بھر کے ملکوں میں پراپیگنڈہ کر کے وہاں آباد یہودیوں کو اکسا رہا ہے کہ وہ اسرائیل میں آباد ہو جائیں۔ اسرائیلی وزیر اعظم ایشکول نے پچھلے ہی دنوں کہا تھا کہ اسرائیل دنیا بھر کے چار کروڑ یہودیوں میں سے ہر ایک کو اپنی حدود کے اندر آباد کر سکتا ہے، سوال یہ ہے کہ اگر یہ چار کروڑ یہودی یو۔ این۔ او کے احکام کی مکمل خلاف ورزی کر کے

آباد کئے جا سکتے ہیں تو ۱۵ لاکھ عرب شرنارتھیوں کو ان کے گھروں میں جانے کی اجازت دے کر یو۔ این۔ او کے ایک درجن سے زیادہ احکام کی تعمیل کیوں نہیں کی جا سکتی؟ جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ اسرائیلی پارلیمنٹ کی بلڈنگ کی پیشانی ہی پر یہ لکھا ہے کہ "اے اسرائیل تیری سرحدیں نیل سے لے کر فرات تک ہیں" مطلب یہ ہے کہ اسرائیل، مصر، لبنان، شام، اردن، عراق اور سعودی عرب کو فتح کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا یہ ارادہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا، لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہی ہے کہ اسرائیل سے متعلق عربوں کا خوف بالکل بے جا نہیں ہے۔ عربوں کا کہنا ہے کہ وہ یہودی مذہب کے ہرگز خلاف نہیں ہیں، آج بھی ہزاروں یہودی عرب ملکوں میں آباد ہیں، عرب یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر لبنان جیسے عرب ملک میں عیسائی اکثریت کو بہت خوشی کے ساتھ قبول کیا جا سکتا ہے تو فلسطین میں یہودی بڑے اطمینان سے رہ سکتے ہیں، شرط صرف یہ ہے کہ اسرائیلی حکمراں گورے سامراجیوں کے ایجنٹ بن کر عربوں کو فتح کرنے کے منصوبے ختم کر دیں اور یو۔ این۔ او کے سب ہی ریزولیوشنوں پر عمل کرتے ہوئے عرب سرزمین پر امن اور شرافت کے ساتھ رہیں، اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل او تھانٹ نے ۱۹ ستمبر ۱۹۶۷ء کو عام اسمبلی کے بائیسویں اجلاس کی اپنی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ "آج دنیا کے سامنے سب سے ضروری اور سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ اسرائیل کی فوج عرب ملکوں کے

وہ علاقے خالی کرے جن پر اس نے جارحانہ قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ مسئلہ دنیا کے لئے اور اتحادی سبھا کے لئے ایک چیلنج ہے۔ اگر اتحادی سبھا کو صحیح معنوں میں امن و انصاف کی حمایت کرنی ہے اور اگر وہ جنگل کے قانون کو مہذب دنیا کا طریق کار بنانا نہیں چاہتی ہے تو لازمی ہے کہ اس چیلنج کو قبول کیا جائے، کسی بھی ملک کو یہ اجازت نہ دی جائے کہ وہ فوجی طاقت سے دوسرے دیش کو شکست دے کر اس کے علاقے پر قابض ہو جائے اور اسے اپنے ملک کا حصہ بنالے۔"

عام اسمبلی کے حالیہ اجلاس اور سلامتی کونسل کی بحثوں سے یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ اسرائیل "جنگل کے قانون" کے علاوہ اور کسی طریقہ کار میں یقین نہیں رکھتا۔ اسرائیلی رعونت کی حد ملاحظہ ہو کہ اس نے ہندوستان اور تین افریشیائی ملکوں کی طرف سے پیش کردہ وہ ریزولیوشن بھی ٹھکرا دیا ہے جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر اسرائیل حالیہ حملے سے ہتھیایا ہوا علاقہ خالی کر دے تو اسرائیل کی سرحدوں اور اس کے وجود کی گارنٹی دی جا سکتی ہے، کسی بھی مجرم کے حق میں اس سے زیادہ نرم رویہ نہیں اپنایا جا سکتا، اسے بھی ماننے سے اسرائیل کا انکار ظاہر کرتا ہے کہ اس کی ہوس ملک گیری کی کوئی انتہا ہی نہیں ہے۔

فرقہ پرستی بنام سیکولرازم

اسرائیل کے ہندوستانی حمایتی کئی بار ایسی باتیں کرتے ہیں جنہیں پڑھ کر ہنسی بھی آتی ہے اور ان کی عقل کا ماتم کرنے کو بھی جی چاہتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک "اسرائیل پلٹ" جرنلسٹ صاحب بار بار یہ رٹ لگائے رہتے ہیں کہ عربوں نے یہودیوں کو بھی کبھی چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیا، یہ سب کچھ لکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہندوستان کی بھولی بھالی جنتا کے فرقہ وارانہ جذبات بھڑک اٹھیں اور وہ اپنے دیش کے اصولوں اور قوم کے اقتصادی اور سیاسی فائدے کو بھلا کر اسرائیل کی حمایت میں جٹ جائیں، مگر ایسا لکھتے وقت وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ انہیں تو شائد ذاتی طور پر اسرائیل بہت کچھ دے سکتا ہے مگر ہندوستانی جنتا کو نا امیدی اور ندامت کے سوائے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔

جو لوگ عربوں کی یہود دشمنی کا ذکر کرتے ہیں وہ صرف اپنی جہالت اور لاعلمی کا ڈھنڈورہ پیٹتے ہیں، انہیں شائد علم نہیں ہے کہ عرب ملکوں میں خاص طور پر مراکش، الجیریا، تیونس اور عدن میں بہت بڑی تعداد میں یہودی اب

بھی آباد ہیں۔ کبھی کسی نے ان کے خلاف کچھ نہیں کہا، آج تک کسی عرب ملک میں
پچھلے ہزاروں برسوں میں یہودیوں کے خلاف کبھی کوئی تحریک نہیں چلائی گئی
یہودیوں کے خلاف جو کچھ بھی ہوا وہ جرمنی اور ایسے ہی مغربی ملکوں میں ہوا
جواب اپنی سامراجی اغراض کے لئے یہودیوں کے سب سے بڑے حامی بنے بیٹھے
ہیں۔ عجب تماشہ یہ ہے کہ یہودیوں پر ظلم توڑے جرمنوں اور یورپیوں نے لیکن
اس کی کسر نکالی جا رہی ہے ان غریب عربوں سے جنہوں نے یہودیوں کو ہمیشہ
عزت اور احترام کی جگہ دی ہے۔ مذہبی طور پر بھی مسلمان یہودیوں کو ایک اہلِ
کتاب مذہب کا درجہ دیتے ہیں، یہودیوں کے پیغمبروں حضرت موسیٰؑ،
حضرت ابراہیم اور دوسرے بزرگوں کو اپنے پیغمبر بھی مانتے ہیں۔

یہودی مذہب کے متعلق عربوں کی فراخدلی کی ایک مثال بمبئی سے
اسرائیلی قونصل خانے کی طرف سے شائع ہونے والے رسالے "نیوز فروم اسرائیل"
ہی کے ماہ جولائی کے شمارے میں دی گئی ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت
سلیمانؑ کے مندر کی وہ دیوار جسے یہودی دنیا کا سب سے مقدس مقام
مانتے ہیں اس وقت تک گندگی اور ملبے میں پڑی رہی جب تک یروشلم پر رومیوں
اور عیسائیوں کا قبضہ رہا مگر جب اس شہر کو مسلمانوں نے فتح کیا تو ایک دن
وہاں کے نئے حاکم سلطان سلیم نے دیکھا کہ کچھ یہودی عورتیں تو گندگی کے
ایک ٹیلے کی طرف دیکھ کر روتی تھیں لیکن عیسائی آبادی وہاں پر کوڑا کرکٹ

پھینکنے آیا کرتی تھی، سلطان نے ایک عیسائی عورت سے پوچھا کہ وہ گندگی یہاں کیوں پھینکتی ہے تو اس نے جواب دیا کہ پادریوں نے اسے ایسا کرنے کو کہا تھا اس کے بعد سلطان سلیم نے یہودی ربیوں سے پوچھا کہ اس جگہ کی اہمیت کیا ہے تو انہوں نے اصلیت بتائی۔ اس پر سلطان نے فوراً سرکاری حکم سے وہ جگہ صاف کرائی اور اس کی نگرانی یہودیوں کے حوالے کردی وہ تو وہاں پر حضرت سلیمانؑ کا مندر بھی بنوا دینا چاہتے تھے لیکن کسی مذہبی بنا پر یہودی مذہبی رہنماؤں نے ان کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہوئے انہیں ایسا کرنے سے منع کر دیا۔

یہ حقیقت بھی شاید کم لوگ جانتے ہوں کہ فلسطین میں انیسویں صدی کے آخر میں چند ہزار یہودیوں کو آباد ہونے کی اجازت سلطان ترکی نے اس بنا پر دی تھی کہ وہ لوگ یورپینوں کے ستائے ہوئے تھے۔

اسرائیل کے ہندوستانی حمایتی شاید یہ بتانا بھی بھول جاتے ہیں کہ اسرائیل دنیا کے ان دو چار ملکوں میں سے ہے جو کھلے بندوں اپنے ملک کی سیاست کی بنیاد ایک خاص مذہب پر رکھتا ہے، اسرائیل کے نئے اور پرانے رہنما بار بار یہ کہتے رہتے ہیں کہ دنیا کا کوئی بھی یہودی بھلے وہ کہیں بھی آباد ہو لسے صرف اسرائیل ہی کا وفادار ہونا چاہئے، یہ ایسی ہی بات ہے جیسے کل چین کہنے لگے کہ دنیا بھر کے بودھوں کو اس کا وفادار ہونا چاہئے کیونکہ سب سے زیادہ بدھ چین میں ہیں یا امریکہ دنیا بھر کے عیسائیوں کو اپنا وفادار بنانے پر تل جائے اور یا

پاکستان مسلمانوں سے وفاداری کا مطالبہ کرنے لگے۔

ہندوستانی یہودی

اسرائیل کا یہ مذہبی اصول کتنا خطرناک ہے اس کا ایک ثبوت یہی ہے کہ ہندوستان اور خصوصاً بمبئی اور کیرالا کے علاقوں میں یہودی سینکڑوں برسوں سے عزت، اطمینان اور خوشحالی کی زندگی گذار رہے ہیں مگر مذہبی منافرت کی بنا پر کئے گئے اسرائیلی پراپیگنڈے کی بدولت آٹھ ہزار یہودی بوریا بستر باندھ کر اپنے سینکڑوں سال پرانے وطن کو چھوڑ کر اسرائیل چلے گئے، یہ بات اور ہے کہ اسرائیل میں چونکہ سفید نسل کے یہودیوں کی اکثریت ہے اس لئے وہاں پر ایشیائی اور افریقی یہودیوں کو دوئم درجے کا شہری سے بہتر نہیں سمجھا جاتا۔ ان لوگوں سے نوکری وغیرہ کے معاملے میں بھی امتیاز برتا جاتا ہے اور انہیں عام یہودیوں میں شادی کی اجازت بھی نہیں دی جاتی ہفتہ وار "بلٹز" کے ۲۷ ر دسمبر ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں ایسے کئی یہودیوں کا ایک خط چھپا تھا جو اسرائیل میں یہودیوں ہی کے خلاف کئے جانے والے نسلی امتیاز کی بنا پر واپس ہندوستان آنا چاہتے ہیں لیکن اسرائیلی حکومت اس کی اجازت نہیں دیتی۔

سوال یہ ہے کہ جو ملک اس قسم کی تنگ نظری پر قائم ہو کیا اسے ہم کسی بھی طرح سے اپنا دوست اور ساتھی سمجھ سکتے ہیں؟ ایک سوال یہ بھی ہے کہ ہندوستان میں یہودی آبادی اتنی کم تھی کہ اس کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن مذہبی بنا پر کسی ملک

سے وفاداری کا اصول ماننے کے نتیجے کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں ہندوستان جیسے ملک میں اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں رہی۔

۶ جون کی صبح کو یعنی حالیہ حملے کے ایک دن بعد اسرائیلی وزیر اعظم اشکول نے "دنیا بھر کے یہودی عوام" کے نام ایک پیغام نشر کرتے ہوئے کہا۔ "اس تاریخی موقع پر ہم اس روح پرور اتحاد کے مظاہروں کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتے جو دنیا بھر کے یہودیوں نے ہماری حمایت میں کئے یہودی عوام اور اسرائیل کی مملکت کے اس احساس یک جہتی نے ہمارے اندر عزم اور اعتماد کی ایک نئی روح پھونک دی ہے، یہودی بھائی چارے اور اتحاد کے جذبے نے ہر قسم کے جغرافیائی اور سیاسی فاصلوں کو یکسر مٹا کر رکھ دیا ہے، ہمیں اعتماد ہے کہ دنیا کے جس کونے میں بھی کوئی یہودی دل دھڑکتا ہے اس سے یہی آواز نکلتی ہے کہ اسرائیل کو فتح نصیب ہو"۔ (یروشلم پوسٹ ۵ جون ۱۹۶۷ء)

اشکول نے گویا یہودیوں کو ایسے مخاطب کیا جیسے وہ اسرائیل ہی کے وفادار ہوں، اس کی بنیاد یہ صیہونی نظریہ ہے کہ دنیا کا ہر یہودی خواہ وہ جرمن ہو یا روسی، امریکن ہو یا انگریز، مصری ہو یا ہندوستانی یا کسی اور ملک کا باشندہ صرف اسرائیل ہی سے وفاداری رکھتا ہے، مذہب کے نام پر عوام کے جذبات سے کھیلنے کی اس سے بدتر مثال شائد مشکل ہی سے ملے، دنیا کے کتنے یہودی اسی اپیل پر کان دھرتے ہوئے عربوں کے خلاف لڑنے میدان میں آگئے حالانکہ عربوں نے

ان ملکوں کا کچھ نہیں بگاڑا تھا، جن کے وہ باشندے تھے مگر مذاق یہ ہے کہ عربوں ہی پر الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ جہاد کی دھمکیاں دے رہے تھے۔

مذہبی تنگ نظری پر قائم اسرائیل میں ہر غیر یہودی سے خواہ وہ مسلمان ہو یا عیسائی غلاموں سے بہتر سلوک نہیں کیا جا سکتا، اسرائیل میں باقی رہنے والے عربوں کو اتنی بھی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے علاقے کے فوجی حاکم کی منظوری کے بغیر اپنے شہر، قصبے یا گاؤں کی میونسپل حدود سے باہر سفر کر سکیں، ان عیسائی اور مسلمان عربوں کو فوج، پولیس اور وزارتِ خارجہ میں سرکاری حکم کی بنا پر بھرتی نہیں کیا جاتا یہ لوگ پرمٹ حاصل کئے بغیر رات کے وقت اپنے ہی وطن کے اندر گھوم پھر نہیں سکتے، پچھلے بیس سال سے اسرائیل کی غیر یہودی آبادی پر باقاعدہ قانونی طور پر "مارشل لا" کے ضابطوں کے تحت حکومت کی جاتی ہے، اسرائیلی لیڈروں نے صریحاً "نسلی امتیاز" کی اس پالیسی سے کبھی انکار نہیں کیا۔ دنیا میں کہیں بھی مذہبی اور نسلی فرق کی بنا پر اتنا زیادہ ظلم نہیں کیا جاتا۔

اس کے مقابلہ میں سب ہی عرب ملکوں میں سب ہی شہریوں کو ایک جیسے سیاسی اور قانونی حقوق حاصل ہیں۔ وہ ملک جو اسلام کو صرف مذہبی بنا پر اپنا سرکاری مذہب مانتے ہیں قانونی طور پر کسی بھی شہری سے کسی قسم کا کوئی فرق نہیں برتتے، مذہبی جہاد کا عربوں پر الزام لگانے والے یہ بھول جاتے ہیں کہ اسرائیل کی بنیاد ہی یہودی فلاسفر ہرزل کے اس خیال پر ہے کہ یہودیوں کو

خدا نے دنیا پر حکومت کرنے کے لئے بنایا ہے، اور ایک دن ساری دنیا پر ان کی حکومت ہو کر رہے گی، ایسی ہی تنگ نظری کے خلاف دنیا کے کئی یہودی لوگ کئی بار آواز اٹھا چکے ہیں، اپنے وقت کے سب سے بڑے سائنسداں آئین سٹین کو اب تک کی بیسویں صدی کا سب سے عظیم یہودی سمجھا جاتا ہے لیکن انہوں نے بھی صاف صاف کہا تھا کہ وہ مذہب کی بنیادوں پر فلسطین میں اسرائیل کے بنائے جانے کے سخت خلاف ہیں، انہوں نے اسی لئے ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے بننے کے بعد اس کا صدر بننا نامنظور کر دیا تھا۔

اب تک ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ اسرائیل کیسے وجود میں آیا اور عرب اسرائیلی جھگڑے کی اصل وجہیں کیا ہیں، مگر جو لوگ جان بوجھ کر جھوٹ پھیلانا چاہتے ہیں وہ کئی اوٹ پٹانگ باتوں کا سہارا لے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اس بات کا ڈھنڈورہ بار بار پیٹا جا رہا ہے کہ فلسطین سے نکالے ہوئے لاکھوں عرب شہریوں کو اپنے پڑوسی عرب ملکوں ہی میں بسنا چاہئے، جن کا مذہب، بول چال اور رہن سہن بھی ان جیسا ہے اور جن کا مجموعی رقبہ بھی اسرائیل سے ستّر گنا زیادہ ہے۔

یہ دلیل کچھ ایسی ہی ہے جیسے کوئی ڈاکو یہ کہے کہ میں جس شریف آدمی کے مکان پر قبضہ کئے بیٹھا ہوں اسے اپنے بھائی کے گھر جا کر رہنا چاہئے کیونکہ اس کے بھائی کا گھر اس مکان سے کئی گنا بڑا ہے اور وہاں پر لوگوں کا رہن سہن بھی بالکل اسی جیسا ہے اس کے برعکس وہ اگر اپنے مکان میں آنا چاہتا ہے تو وہ یہاں گزر نہیں کر سکے گا کیونکہ میرا رہن سہن اس آدمی سے کہیں اونچا ہے جسے میں نے دھکے دے کر اسے اس کے اپنے ہی مکان سے نکالا تھا۔

یہ دلیلیں اتنی بودی ہیں کہ پچھلے بیس برسوں میں کئی بار پیش کرنے کے باوجود ایک بار بھی اقوام متحدہ میں انہیں قبول نہیں کیا گیا۔ اقوام متحدہ کے بارہ ریزولیوشن اسی مسئلہ پر موجود ہیں، ان سب میں ایک ہی بات دہرائی جاتی ہے کہ اسرائیل ان شرنارتھیوں کو اپنے گھروں کو واپس جانے کا حق دے مگر اسرائیل نے ہمیشہ انہیں حقارت سے ٹھکرایا ہے، اسی اسرائیل کے بارے میں اس کے حمایتی یہ کہتے ہوئے نہیں تھکتے کہ اسے یو۔ این۔ او نے بنایا تھا لیکن جان بوجھ کر وہ یہ نہیں بتاتے کہ عرب شرنارتھیوں ہی کے سوال پر نہیں بلکہ کسی بھی اہم سوال پر اسرائیل نے یو۔ این۔ او کا کوئی بھی فیصلہ قبول نہیں کیا۔

اسرائیل کے حمایتی کبھی اس بات پر بھی بغلیں بجاتے ہیں کہ اس نے بہت بڑے عرب علاقے پر قبضہ کر لیا ہے۔ اسی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل انہیں خالی کرنے کا مطالبہ نہیں مان سکتا، ایک اسرائیل نواز ایڈیٹر نے دور کی کوڑی لاتے ہوئے لکھا ہے کہ "روس اور اس کے ساتھی اور بھارت کے ناسمجھ حاکم یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ اسرائیل عربوں کے علاقے خالی کرے۔ شائد یہ لوگ خوابوں کی دنیا میں رہ رہے ہیں یہ سمجھ رہے ہیں کہ عربوں نے یہ علاقے رضامندی سے اسرائیل کو دیئے تھے... اسرائیل نے انہیں خون دے کر حاصل کیا ہے۔ یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اسرائیل نے یہ علاقے جنگ میں جیتے ہیں" آگے چل کر یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان نے ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد ایک دوسرے کے علاقے خالی ضرور کر دیئے تھے مگر یہ مثال اس معاملہ میں اس لئے ٹھیک نہیں بیٹھتی کہ کچھ علاقہ ہندوستان نے جیتا تھا اور کچھ پاکستان نے۔ اسی لئے ہم نے یہ علاقے خالی کرنے منظور کر لئے، مگر چونکہ اسرائیل

کو مکمل فتح ہوئی ہے اس لئے وہ یہ اصول نہیں مان سکتا۔

ہمارے خیال میں کسی غیر ملک کی حمایت میں اپنے دیش سے دشمنی کی اس سے بدتر مثال اور کوئی نہیں ہو سکتی، اگر یہ دلیل مان لی جائے کہ فاتح ملک جیتے ہوئے علاقوں پر قبضہ قائم رکھنے کا حق رکھتا ہے تو ہم چین کو کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے علاقے خالی کرے اور جب تک وہ ایسا نہیں کرتا اس سے کوئی بات چیت نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور پاکستان کی مثال دے کر بھی اِن صاحب نے اپنی غلامانہ ذہنیت اور وطن دشمنی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان نے لاہور اور سیالکوٹ کے علاقے صرف اس لئے خالی کئے ہیں کیونکہ پاکستان نے بھی ہمارے کئی اہم علاقوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔ حالانکہ ہمارا کہنا یہ ہے کہ ہم پاکستان کے مقابلے میں انتہائی اچھی پوزیشن میں تھے لیکن اس کے باوجود ہم نے یہ علاقے خالی کئے کیونکہ ہم جنگ سے معاملہ طے کرنے کا اصول ہی نہیں مانتے۔

بودی دلیلیں

بار بار یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندوستان عربوں کی حمایت صرف اس لئے کر رہا ہے کہ ہم مسئلہ کشمیر کے بارے میں ڈرتے ہیں کہ اگر ہم نے حمایت نہ کی تو وہ ہمارے خلاف ہو جائیں گے، دلچسپ بات یہ ہے کہ عین ایسا ہی بہتان اور الزامات مخالف ملکوں کے ریڈیو اور اخبار دن رات ہندوستان پر لگاتے رہتے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ ہندوستان پر یہ پہلی بار نہیں ہے کہ ایسا الزام لگایا گیا ہو، آزادی سے پہلے جب گاندھی جی نے فلسطین کے عربوں کی حمایت کی تھی تو دنیا بھر کے یہودی حلقے باپو پر یہی بہتان لگاتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے عربوں کی حمایت

کر رہے ہیں۔ گاندھی جی نے نومبر ۱۹۳۹ء میں اپنے ایک مضمون میں صاف صاف یہ کہا تھا کہ وہ اسے اپنی بدترین توہین سمجھتے ہیں، وہ کسی کو خوش کرنے کے لئے نہ کسی کی حمایت کرتے ہیں اور نہ مخالفت، وہ اس لئے عربوں کی حمایت کر رہے ہیں کیونکہ فلسطین ان ہی کا ملک ہے اور ہزاروں میل دور سے آنے والے یہودی انگریزی سامراج کی طاقت کی مدد سے وہاں کے عربوں کو دبا کر وہاں آباد ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے، اب تک ہندوستان کی پالیسی باپو کے اسی نقش قدم پر کاربند ہے۔

ایک عام بات یہ کہی جاتی ہے کہ عرب اسرائیل کے خلاف اسلامی جہاد کے نعرے کا سہارا لے رہے ہیں یہ بھی بالکل اوٹ پٹانگ اور بے ڈھنگی بات ہے، ہو سکتا ہے کہ کچھ عرب رہنماؤں یا عرب جنتا کے کسی حصے میں مذہبی بنا پر بھی اپنی آزادی کی جنگ لڑنے کی کوشش کی ہو، یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے کہ ہم پر جارحانہ حملے کے وقت ہمارے ملک کے کئی فرقوں نے اپنے اپنے طور پر اپنے مذہب کے فرمانوں کی بنا پر دشمن کا مقابلہ کرنے کی قسم کھائی تھی، مگر اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ہندوستان مذہبی بنا پر جنگ لڑنا چاہتا ہے، جس طرح ہندوستان کے کسی بڑے قومی لیڈر نے ان دونوں لڑائیوں کے دوران مذہبی تعصبات ابھارنے کی کوشش نہیں کی اسی طرح عرب رہنماؤں نے خاص طور پر صدر ناصر نے کبھی اپنی آزادی کی جدوجہد کے لئے مذہب کا سہارا نہیں لیا۔

ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ عرب پسماندہ ہیں اور اسرائیل ترقی پذیر ہے اس لئے ہندوستان کو اسی کا ساتھ دینا چاہیئے۔ اس باب کے شروع میں ہم یہ

دیکھ چکے ہیں کہ اسرائیلی "ترقی" میں ہندوستان کو نقصان ہی نقصان ہے فائدہ کوئی نہیں، یہ بھی ظاہر ہے کہ جس ملک میں اسّی فی صدی یورپین اور امریکن آبادی ہو اور جسے تقریباً پانچ لاکھ ڈالر روزانہ کے حساب سے غیر ملکی امداد ملتی ہو وہ آس پاس کے ایشیائی افریقی پڑوسیوں کے مقابلے میں یقیناً ترقی یافتہ ہوگا، آپ کو یاد ہوگا کہ گوا کی آزادی سے پہلے پرتگالی حاکم بھی یہی کہا کرتے تھے کہ گوا سماجی، اقتصادی اور ہر لحاظ سے ہندوستان سے زیادہ ترقی پسند ہے، فرض کیجئے وہاں کی مقامی آبادی کو نکال کر پرتگالی وہاں آباد کر دیئے جاتے تو یہ لوگ عام ہندوستانیوں کے مقابلے میں یقیناً زیادہ آگے بڑھے ہوئے ہوتے، مگر اسی بنا پر گوا پر ہم ان کا حق نہیں مان سکتے تھے۔ دو سو برس تک انگریز حاکم بھی تو یہی کہتے رہے کہ ہم پچھڑے ہوئے ہندوستانیوں کو ترقی کی راہ پر لے جا رہے ہیں، اب جنوبی افریقہ اور جنوبی روڈیشیا کے گورے حکمران بھی تو یہی کہتے ہیں کہ وہ "تاریک افریقہ" میں نئی تہذیب کا نور پھیلانا چاہتے ہیں اگر ان سفید فام سامراجیوں کی دلیلوں کو ہم تسلیم نہیں کرتے تو فلسطین پر اسرائیلی سامراجیوں کے حق کو کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

ہندوستان کدھر اور کیوں؟

پچھلے صفحات سے یہ صاف واضح ہو گیا ہے کہ اسرائیل کے کسی دعوے اور دلیل میں کسی قسم کا کوئی اخلاقی یا قانونی وزن نہیں ہے اسی لئے اس کے حمایتی اکثر غاصی اوٹ پٹانگ باتیں کرتے رہتے ہیں جو اصلی مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں، مثال کے طور پر بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ اسرائیل جمہوری ملک ہے اس لئے ہندوستان کو اسرائیل ہی کا ساتھ دینا چاہیے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ نہر سویز بند ہونے سے ہندوستان کو بھاری نقصان ہو رہا ہے جس کے لئے مصر ذمہ دار ہے۔ آخر میں اس بات کا بھی واسطہ دیا جاتا ہے کہ ہندوستان چونکہ غیر جانبداری میں یقین رکھتا ہے اس لئے اسے عربوں اور اسرائیل کے جھگڑے میں غیر جانبدار رہنا چاہیئے۔

آئیے ایک ایک کر کے ان سب ہی دلیلوں کو جانچیں اور پرکھیں، جہاں تک عربوں کے آپسی اختلافات کا تعلق ہے یہ بات ظاہر ہی ہے کہ کئی اختلافات کے باوجود اس بات کے بارے میں سب ہی متفق ہیں کہ اسرائیلی جارحیت کو برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ عرب ملکوں کی خرطوم میں ہونے والی چوٹی کانفرنس میں اس کا اچھی طرح سے ثبوت مل گیا تھا، اگر کچھ اختلافات ہیں تو وہ صرف اس سوال پر ہیں کہ اسرائیل کے خلاف کوئی فوری سخت قدم اٹھانا چاہیئے یا کچھ دیر انتظار کرنا چاہیئے کہ عالمی دباؤ کے

سہارے اسرائیل ٹھیک راستے پر آجائے۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ عرب دنیا کے اختلافات سے اسرائیل کو کیسے حق پہنچتا ہے کہ وہ ان کے علاقے کو ہتھیا لے، یہ تو کچھ ایسی ہی بات ہوئی جیسے کوئی چور یہ کہے کہ میں نے جس گھر پر ڈاکہ مارا ہے وہاں پر رہنے والے بھائی آپس میں اختلافات رکھتے ہیں اس لئے ان کے مال پر میرا حق ہے، سوچنے کی تیسری بات یہ بھی ہے کہ اختلافات کہاں نہیں ہوتے؟ ایک ہی خطہ کے کئی ملکوں کو تو الگ چھوڑیے کیا ایک ہی ملک میں اختلافات نہیں ہیں، ایک ہی مذہب کی الگ الگ شاخوں کے درمیان بھی گہرے اختلافات پائے جاتے ہیں، میں اپنے ہی دھرم آریہ سماج کی بات کرتی ہوں۔ میرے نانا آچاریہ رام دیو، سوامی دیانند سرسوتی کے خاص چہیتے چیلوں میں سے تھے، ان ہی کی سرکردگی میں گوروکل کانگڑی کا ادارہ قائم کیا گیا تھا، اسی وقت آریہ سماج میں دو پارٹیاں، کالج پارٹی اور گوروکل پارٹی بن گئی تھیں، اب تو خیر کم از کم چار گروپ موجود ہیں، ظاہر ہے کہ جس طرح یہ بات بالکل فروعی ہے اسی طرح یہ کہنا بھی عرب اسرائیل جھگڑے سے کوئی تعلق نہیں رکھتا کہ اسرائیل کی حمایت اس لئے کرنی چاہیئے کہ عربوں میں اختلافات ہیں، یہ دلیل کچھ ایسی ہی ہے جیسے چین یہ کہے کہ وہ ہمارے علاقے اس لئے خالی نہیں کرتا کیونکہ ہمارے اندر مذہب، زبان، صوبہ اور پارٹی بازی کی بنا پر اختلافات پائے جاتے ہیں

جارحانہ "جمہوریت"

عین اسی طرح یہ کہنا بھی بے معنی ہے کہ اسرائیل ایک جمہوری ملک ہے اس لئے ہمیں اس کا ساتھ دینا چاہیئے، پہلی بات تو یہ ہے کہ جس ملک کا وجود صرف ایک مذہب کے یعنی یہودی مذہب کے ماننے والوں کی برتری کی بنا پر ہوا ہے اسے ہرگز جمہوری نہیں کہا جاسکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ اسرائیل میں آباد مسلمان اور عیسائی عربوں کے خلاف کھلم کھلا اور

باقاعدہ قانونی طور پر اس قسم کے نسلی اور مذہبی تعصب کا سلوک کیا جا رہا ہے جس کے سبب انہیں دوئم درجے کے شہریوں کے حقوق بھی حاصل نہیں ہیں، پچھلے بیس برسوں سے اسرائیل کے غیر یہودی باشندے مارشل لا کے قوانین میں جکڑے ہوئے ہیں۔

کیا ایسے ملک کو جہاں مذہبی اور نسلی تعصب کی حالت یہ ہو جمہوریت کا نام دیا جا سکتا ہے؟ اگر اسرائیل کو جمہوری ملک مان لیا گیا تو پھر جنوبی افریقہ اور جنوبی روڈیشیا سے بھی ہمیں اپنے تعلقات اچھے بنا لینے چاہئیں، یاد رہے کہ ان دو ملکوں کو بھی ہم صحیح معنوں میں جمہوری دیش صرف اس لئے نہیں مانتے کہ وہاں پر بسنے والے غیر گورے لوگوں کے خلاف نسلی امتیاز کی پالیسی برتی جاتی ہے بالکل یہی حال اسرائیل کا ہے۔

ایک دوسری بات یہ بھی ہے کہ فرض کیجئے (حالانکہ یہ بالکل غلط ہوگا) کہ اسرائیل ایک جمہوری ملک ہے بالکل ویسا جیسا کہ برطانیہ، مگر سوال یہ ہے کہ کیا ہم نے جمہوری ملک برطانیہ کو یہ حق دیا تھا کہ وہ ہم پر راج کرتا رہے؟ سیدھی سی بات یہ ہے کہ عام قانون کی طرح عالمی قانون میں بھی اس بات کی کوئی اہمیت نہیں ہے کہ مجرم کن عقائد کا ماننے والا ہے، بڑی بات یہ دیکھی جاتی ہے کہ اگر اس نے جرم کیا ہے تو اس کی سزا اسے ملنی چاہئے عین اسی طرح اسرائیل کو مجبور کرنا ہی پڑے گا کہ وہ عرب علاقے خالی کر دے، اس سلسلے میں یہ سوال کوئی حقیقت نہیں رکھتا کہ وہ ایک جمہوری ملک ہے یا غیر جمہوری۔

نہر سویز

جہاں تک نہر سویز کے بند ہونے سے ہندوستان کے بھاری نقصان کا تعلق ہے اس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن سوال یہ ہے کہ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ صاف ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری اسرائیل پر ہے جس نے ابھی تک مصر کے بڑے

علاقے اور سویز کے مشرقی کنارے پر اس طرح قبضہ جمار کھا ہے جیسے عالمی غنڈہ گردی کی سب سے بڑی مثال کہیں تو بجا ہو گا، اسرائیل کے وزیر اعظم نے حال ہی میں ہیکڑی کے ساتھ یہاں تک کہا کہ اسرائیل کے ساتھ بات چیت کئے بغیر نہر سویز کو کھولا نہیں جا سکتا، ایک سیدھی سی بات یہ بھی ہے کہ نہر سویز کے بند ہونے سے اگر ہندوستان اور دوسرے عرب ایشیائی ملکوں کو نقصان ہو رہا ہے تو سب سے زیادہ نقصان مصر کو ہو رہا ہے جسے ہر روز تقریباً ایک کروڑ پونڈ سویز میں سے گزرنے والے جہازوں سے وصول ہوتے تھے، ظاہر ہے کہ مصر خوشی سے یہ نقصان برداشت نہیں کر رہا۔ اگر اسرائیل کے ہندوستانی حامیوں کو ہندوستان کے نقصان کا اتنا ہی غم ہے تو انہیں چاہئے کہ وہ اپنے سر پرست اسرائیل پر زور دیں کہ وہ نہر سویز کا مشرقی کنارہ خالی کر دے تاکہ وہاں پر جہاز رانی شروع ہو سکے۔

غیر جانبداری کی دہائی

ہندوستان کی غیر جانبداری کے بارے میں سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ہی لوگوں نے جو مصر اور اسرائیل کے معاملے میں ہندوستان کو غیر وابستہ دیکھنا چاہتے ہیں غیر وابستگی کی پالیسی کی کبھی حمایت نہیں کی، ہمیشہ وہ اس کا مذاق اڑاتے رہے ہیں مگر اب اسی کا نام لے کر ٹسوے بہا رہے ہیں، ہندوستان کی غیر جانبداری کی پالیسی کے بارے میں امن کے دیوتا سورگیہ پنڈت نہرو نے بار بار کہا تھا کہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم سچ اور جھوٹ کی ٹکر میں غیر جانبدار رہیں گے، ہم نے ہمیشہ امن اور آزادی کی طاقتوں کا ساتھ دیا ہے اور دیتے رہیں گے، اسی لئے ہندوستان نے ہمیشہ اور ہر جگہ آزادی پسندوں کی حمایت کی ہے اور سامراجیوں کی مخالفت، عرب اسرائیلی

جھگڑے میں بھی آج سے نہیں بلکہ پچھلے ۳۵ سال سے ہندوستان کی پالیسی یہی رہی ہے، باپو نے کئی بار یہ کہا کہ فلسطین پر یورپ اور امریکہ کے یہودی کوئی حق نہیں رکھتے۔ پنڈت نہرو کی رہنمائی میں ہندوستان نے اسی غیر وابستگی کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ۱۹۵۶ء میں مصر پر تین طاقتی سامراجی حملے کی پر زور مذمت کی تھی، گیتا کے خالق بھگوان کرشن کے آدرشوں میں وشواس رکھنے والا ہندوستان غیر وابستگی سے صرف یہی مراد لیتا ہے کہ ہم ہمیشہ کے لئے کسی ایک بلاک سے منسلک نہ ہو جائیں مگر جہاں بھی انصاف اور ناانصافی کی ٹکر ہوگی ہم انصاف کے ساتھ ہوں گے عرب اسرائیل جھگڑے کے بارے میں ہندوستان کی پالیسی ہمیشہ سے واضح رہی ہے، نومبر ۱۹۳۸ء میں ایک اخباری مضمون کے دوران بھی پنڈت جی نے کہا تھا کہ فلسطین بنیادی طور پر ایک عرب ملک ہے اور وہاں پر عرب عوام ہی کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہونی چاہیئے۔

عرب ملکوں سے ہندوستان کے اچھے تعلقات کی بنیاد صرف اصولی یا جذباتی نہیں ہے ہماری قومی تحریک نے جن اصولوں کی بنا پر عربوں کا ساتھ دیا ہے اس کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔ لیکن ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ عرب دنیا کے ساتھ ہمارا اتنا گہرا اقتصادی اور سیاسی مفاد وابستہ ہے کہ اس کے سوائے ہمارے لئے اور کوئی راستہ ہو ہی نہیں سکتا، شریمتی گاندھی نے اسی لئے کہا ہے کہ عربوں کی حمایت ہم قومی آدرشوں کی بنا پر بھی کرتے ہیں اور قومی مفاد کے خیال سے بھی۔

یہ بات کتنی سچ ہے اس کا اندازہ ہمیں عرب دنیا کے ساتھ اقتصادی رشتوں پر ایک نظر ڈالنے سے ہو جائے گا، ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کے ساتھ اقتصادی

رشتے ہماری اقتصادی زندگی کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتے ہیں یہ بھی ظاہر ہے کہ کسی ملک کے لئے اقتصادی فائدے کا سب سے اہم روپ ہوتا ہے اس کی تجارت

یہ جان کر شائد بہتوں کو حیرانی ہو کہ عرب دنیا کے تیرہ [۱۳] عرب دیش ملا کر جتنی بڑی مقدار میں ہمارا مشینی سامان خریدتے ہیں اتنا اور کوئی نہیں خریدتا، تمام عرب دیشوں سے ہمیں مجموعی طور پر لگ بھگ ایک ارب روپے کی آمدنی ہوتی ہے، یہ آمدنی اس کے علاوہ ہے جو ہم اپنی چیزوں کے بدلے میں کچے مال کی صورت میں تبادلے کے طور پر منگواتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم عرب ملکوں کو تقریباً تین ارب روپے کا سامان بھیجتے ہیں اور وہاں سے دو ارب روپے کا مال حاصل کرتے ہیں۔

عرب ملکوں سے آنے والے سامان میں تیل، مصری اور سوڈانی روئی، فاس فورس اور اسی قسم کی کئی ایسی چیزیں شامل ہیں جو ہماری صنعتوں کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہیں، ہمارے دیش میں بنی مصنوعات خاص طور پر بجلی کا سامان ہلکی پھلکی مشینیں (سائیکل، سلائی مشینیں اور پنکھے وغیرہ) ہوزری کا سامان اور سوتی اونی، ریشمی اور ریان کے کپڑے وغیرہ کے جتنے بڑے گاہک عرب ملک ہیں اتنا دنیا کا کوئی اور خطہ نہیں ہے۔ یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ عرب ملکوں کے تیل کی آمدنی اتنی زیادہ ہے کہ وہ آسانی کے ساتھ ہمارے مال کی قیمت پونڈ اسٹرلنگ میں چکا سکتے ہیں، مثال کے طور پر ایک کویت ہی کے ساتھ ہم نے پچھلے سال ۳۵ کروڑ روپے کی تجارت کی۔ عراق کو پچھلے ہی سال ۲۶ لاکھ پونڈ کا مال بیچا گیا، اس میں چائے اور پٹ سن کے علاوہ بجلی کے پنکھے، سائیکل اور ڈیزل مشینیں شامل تھیں، سوڈان کے ساتھ ہماری تجارت ۳۰ کروڑ روپے سے اوپر جا چکی ہے۔ متحدہ عرب جمہوریہ کے

ساتھ اگلے برس تک ہماری تجارت کی کل رقم سو کروڑ روپے سے بھی اوپر جا پہنچے گی
ان سب ہی ملکوں کے ساتھ ہماری تجارت کا توازن بہت زیادہ حد تک ہمارے
حق میں ہے۔

قومی نفع نقصان

اس کے علاوہ عرب ملکوں میں اس وقت ڈھائی لاکھ سے زیادہ ہندوستانی
بہت ہی منافع بخش تجارت اور بہت ہی اچھی قسم کی نوکریوں پر مامور ہیں،
اکیلے عراق ہی میں ۳۵ ہزار سے زیادہ ہندوستانی خاندان بڑے ہی منافع بخش
کاموں میں مصروف ہیں، کویت میں ۳۰ ہزار ہندوستانی، عدن میں ۲۵ ہزار، بحرین
میں دس ہزار اور سعودی عرب میں ۲۰ ہزار ہندوستانی شہری موجود ہیں، الجیریا
سوڈان، عراق، کویت اور لیبیا وغیرہ میں ہندوستانی استادوں، انجینیروں،
پروفیسروں، ڈاکٹروں اور دوسرے ٹیکنیکل ماہروں کی مانگ دن بدن بڑھ رہی
ہے، دنیا بھر میں یہی علاقے ایسے ہیں جہاں ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہندوستانیوں
کے لئے نوکری کے موقعے مہیا کئے جا رہے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہی ہے کہ یہ لوگ
ہندوستان کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ ایسی دوستی کی ایک مثال کویت سرکار کا یہ
فیصلہ ہے کہ وہ ہندوستان میں ایک کروڑ پونڈ کا سرمایہ مختلف صنعتوں میں
لگائے گی، چند برسوں میں یہ سرمایہ ایک ارب پونڈ یعنی ۲۱ ارب روپے کے قریب
جا پہنچے گا۔ اس کے علاوہ کویت ہی نے ہندوستان کے ریزرو بنک میں ۲۰ کروڑ
پونڈ کی پونجی لگا رکھی ہے، عراق، کویت اور لیبیا وغیرہ کے ساتھ ہندوستان
تیل نکالنے وغیرہ سے متعلق کئی مشترکہ اسکیموں پر کام بھی کر رہا ہے، ان سے ہمارے

ملک کو کروڑوں روپے کا فائدہ ہوگا۔

اسرائیلی حملے کے بعد کئی عرب ملکوں نے برطانیہ، امریکہ اور مغربی جرمنی کا اقتصادی بائیکاٹ کر رکھا ہے، ان پچھمی ولیشوں سے تجارت اور آرتھک ناطے ٹوٹنے کی وجہ سے عرب ملکوں میں ہندوستانی سامان کی مانگ بھی بڑھ رہی ہے اور ہندوستانیوں کے لئے وہاں روزگار وغیرہ کے بھی بہت اچھے موقعے نکل آئے ہیں حال ہی میں ہند سرکار نے عرب ملکوں کا دورہ کرنے کے لئے سرکردہ بیوپاریوں اور آرتھک ماہروں کے تین وفد بھیجے تھے ان وفدوں کی رپورٹ ہے کہ جنگ کے بعد بھارت کے عرب دوست رویے اور عربوں کے مغربی ملکوں سے تعلقات بگڑنے کے کارن وہاں پر بھارتی مال کی مانگ پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے اس کے مقابلے میں اسرائیل سے ہمیں کیا مل سکتا ہے؟ آئیے اسے بھی سمجھنے اور جانچنے کی کوشش کریں۔

اسرائیلی سراب

اسرائیل کو ہم نے پچھلے سال صرف ساڑھے بارہ لاکھ روپے کا مال بیچا اور ساڑھے دس لاکھ کا منگوایا۔ مطلب یہ ہے کہ مشکل سے دو لاکھ روپے کا فائدہ ہوا اسرائیل اور اس کے وکیل چاہے جتنا سر ماریں اس سے زیادہ فائدہ ہو بھی نہیں سکتا اسرائیل کی آبادی صرف ۲۶ لاکھ کے قریب ہے ان میں سے بیس لاکھ سے زیادہ وہ یہودی ہیں جو کچھ ہی دیر پہلے یورپ اور امریکہ سے وہاں آئے تھے ان لوگوں کے امریکہ اور یورپ سے اتنے گہرے تعلقات ہیں کہ انہیں جو چیز بھی منگوانا ہوتی ہے امریکہ اور یورپ ہی سے منگواتے ہیں جہاں سے وہ انہیں تقریباً مفت ہی مل جاتی ہے۔ ہندوستان

سے تجارت کرکے نہ وہ ہم سے کچھ خرید سکتے ہیں اور نہ ہمیں کچھ بیچ سکتے ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اسرائیل خود ان ہی چھوٹی صنعتوں کو بڑھاوا دینا چاہتا ہے جن پر ہم زور دے رہے ہیں، افریقہ کے کئی ملکوں اور برما اور نیپال وغیرہ میں تو اسرائیل ملکے مشینی سامان اور مصنوعات کے معاملے میں ہندوستان کا بہت بڑا رقیب بن چکا ہے چونکہ اسے ہر سال مغربی ملکوں سے تقریباً ۳۰ ارب روپے مالی اور فوجی امداد اور چندوں اور قرضوں کی صورت میں وصول ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنے سامان کو ہمارے مقابلے میں خاصی کم قیمت پر بیچ کر ہماری منڈیاں خراب کرنا چاہتا ہے۔

اسرائیل خوراک کے معاملہ میں مستقل طور پر امریکہ کا بھکاری ہے وہاں پر جتنا اناج استعمال ہوتا ہے اس کا تقریباً آدھا حصہ باہر سے آتا ہے، یاد رہے کہ ہندوستان اپنی ضرورت کے دسویں حصے سے زیادہ اناج باہر سے نہیں منگواتا، سارے ایشیائی افریقی علاقے میں کسی اور ملک کا مغربی امداد پر اتنا زیادہ دارومدار نہیں ہے جتنا کہ اسرائیل کا ہے مگر اس کے باوجود اسرائیل کا بجٹ ہمیشہ گھاٹے کا بجٹ ہی رہتا ہے، امریکہ کے مشہور رسالے نیوز ویک نے اپنی ۱۶ر جنوری ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں لکھا ہے کہ فی کس اور مجموعی اعتبار سے جتنی امداد اسرائیل کو ملی ہے دنیا کے کسی اور ملک کو نہیں ملی مگر اس کے باوجود اسرائیل کے بجٹ کا گھاٹا کم ہونے میں نہیں آتا، اسی اخبار نے آگے چل کر لکھا ہے کہ ۱۹۵۷ء سے لے کر ۱۹۶۵-۶۶ء تک اسرائیل جو مال باہر بھیجتا تھا اور جو باہر سے منگواتا تھا اس میں پچاس کروڑ ڈالر ہی کا گھاٹا ہوا کرتا تھا مگر ۱۹۶۶-۶۷ء میں یہی گھاٹا ۶۶ کروڑ ڈالر سے اوپر چلا جائے گا" ظاہر ہے

حالیہ جنگ کے بعد اسرائیل کا یہ کھاٹا اور بھی بڑھ جائے گا۔

اقتصادی مقابلہ

عرب ملک تو دو لاکھ ہندوستانیوں کو تجارت اور اچھی نوکریوں کے موقعے مہیا کر رہے ہیں لیکن اسرائیل میں مغربی ملکوں سے آنے والے پڑھے لکھے لوگوں اور ٹیکنیکل کارکنوں کی پہلے ہی اتنی بھرمار ہے کہ حالیہ جنگ سے پہلے تک وہاں پر دس پڑھے لکھے آدمیوں میں سے دو بیکار تھے، ایسے ملک میں کسی بھی ہندوستانی کے لئے نہ تجارت کا موقعہ ہے اور نہ نوکری کا۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی غیر یہودی ہندوستانی کو وہاں پر نوکری یا تجارت کرتے نہیں دیکھا گیا بلکہ جو چند ہزار ہندوستانی یہودی اسرائیلی پراپیگنڈے میں آکر وہاں چلے گئے تھے اب لگاتار کوشش کر رہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح واپس ہندوستان آجائیں۔ ایسا ملک کبھی ہندوستان کی کوئی قابلِ ذکر مدد کر ہی نہیں سکتا، وہ جو کچھ بھی کسی کو دیتا ہے اپنے ان داتا امریکہ ہی سے لے کر دیتا ہے، شریمتی گاندھی نے کچھ دیر پہلے اسرائیلی وکیلوں کو جواب دیتے ہوئے ایک بڑی ہی دلچسپ بات کہی تھی کہ ہندوستان کو اگر کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو وہ براہ راست امریکہ ہی سے اسے حاصل کرے گا اسرائیل کی معرفت نہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ امداد کے بارے میں اخباری ہوائیاں چھوڑنے کے علاوہ اسرائیلی حکمرانوں نے ہندوستان کو کبھی کوئی پیشکش کی ہی نہیں، اسرائیل کے ڈھنڈورچی اس کے باوجود ہندوستان کے بارے میں اسرائیل کی فرضی فراخدلی کے متعلق زمین و آسمان کے قلابے ملانے میں لگے رہتے ہیں ان کی یہ ہوائیاں کس قدر بے بنیاد ہیں اس کا ثبوت ہمیں پچھلے ہی سال مِل گیا تھا، آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال اسرائیلی

حمایتیوں نے خوب ڈھنڈورہ پیٹا تھا کہ اسرائیل خوراک کے معاملے میں ہندوستان کی مدد کر سکتا ہے، ظاہر ہے کہ جو ملک خود دانے دانے کا محتاج ہو وہ کسی کو کیا دیگا مگر سرکاری طور پر بھی اس بے پر کی ہوائی کی قلعی اس وقت کھل گئی جب ۱۰ ارمئی ۱۹۶۶ء کو اس وقت کے وزیر خوراک شری سبرامنیم نے اعلان کیا کہ اسرائیل نے ایسی کوئی پیشکش نہیں کی تھی، تھوڑی سی مصنوعی کھاد اسرائیل نے پیش ضرور کی تھی مگر ہند سرکار نے زیادہ بڑی مصلحتوں کی بنا پر اسے قبول نہیں کیا۔ عین یہی حال ایک حالیہ گپ کا ہوا ہے کہ اسرائیل نے ہندوستان کو ۵۰ کروڑ ڈالر کی امداد شری ایس کے پاٹل کی معرفت پیش کی تھی۔ خود ہی شری پاٹل نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ایسی امداد کبھی پیش نہیں کی گئی۔

سچ تو یہ ہے کہ مغربی ممالک کا پالتو پلا اسرائیل جو ہندوستانی سپوتوں کو بے رحمی سے قتل کرنے سے گریز نہیں کرتا، جہاں موقعہ ملتا ہے ہماری منڈیاں خراب کرنا چاہتا ہے اور مغربی اشاروں پر افریشیائی آزادی کو ہڑپ کرنے کے درپے ہے اس سے ہندوستان جیسے آزادی پسند ملک کو کسی قسم کی مدد کی توقع ہی نہیں کرنی چاہیئے۔

سیاسی نفع نقصان

اوپر کے جائزے سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہندوستان کو عربوں سے جہاں کروڑوں بلکہ اربوں کا ہر سال مالی فائدہ ہوتا ہے وہاں اسرائیل سے اسے وعدوں کے سبز باغ اور جھوٹی تسلیوں کے سوائے اور کچھ بھی نہیں مل سکتا۔

اب آیئے اسی مسئلے کے سیاسی پہلو کی طرف۔ اسرائیل کے ڈھنڈورچی

عربوں کے بارے میں اکثر اوٹ پٹانگ باتیں کہتے رہتے ہیں سب سے اہم یہ کہ عرب ملک ایک ہندو دشمن بلاک بنانا چاہتے ہیں، اس قسم کی اوٹ پٹانگ باتوں سے اسرائیل کے وکیل ہندوستان کی بھولی بھالی جنتا کو فرقہ پرستی کی راہ پر لگا کر اپنے اسرائیلی سرپرستوں اور اپنے امریکی آقاؤں کی سامراجی سیاست کا الو سیدھا کرنا چاہتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ عرب ملک اسی طرح قوم پرستی میں یقین رکھتے ہیں جس طرح کہ ہم ہندوستانی قوم پرستی میں۔ متحدہ عرب جمہوریہ، شام، عراق اور الجیریا وغیرہ تو خاص طور پر مذہبی تنگ نظری کے زبردست مخالف ہیں، اسی کا ایک تازہ ثبوت یہ ہے کہ سب ہی عرب ملکوں کے رہنما جن میں سعودی عرب کے شاہ فیصل اور اردن کے شاہ حسین بھی شامل ہیں ہندوستان کا بار بار شکریہ ادا کر چکے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ہند مخالف پراپیگنڈے کا کوئی اثر نہیں ہوا، جہاں تک کشمیر کا سوال ہے اگر دو تین عرب ملک پاکستان کے حامی ہیں تو متحدہ عرب جمہوریہ ہندوستان کا حامی ہے مجموعی طور پر عرب ملکوں کا یہ کہنا ہے کہ وہ کشمیر کے معاملے میں کسی بھی فریق کی حمایت نہیں کرتے وہ یہ چاہتے ہیں کہ جھگڑا دو ملکوں کے درمیان پرامن طریقے سے کسی باہر والے کی مدد کے بغیر طے ہو جائے۔ یاد رہے کہ ہند سرکار بھی چاہتی ہے کہ یہ مسئلہ باہر والوں کے دخل دیئے بغیر پُرامن طریقے سے طے ہو جائے۔

عرب ملکوں میں ہند دشمن پراپیگنڈے کے لئے جو چیز سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے وہ ہندوستان میں اسرائیل کے حامیوں کی تحریریں اور تقریریں ہیں۔ یہ تحریریں چھاپ چھاپ کر ہمارے مخالف ملک یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ہندوستان عربوں کا بہت بڑا دشمن ہے، یاد رہے کہ مغربی ایشیا میں پاکستان

بھی اپنا کروڑوں روپے کا مال اور تقریباً ویسا ہی سامان جیسا کہ ہم بیچ رہے ہیں لیکن عربوں کے بھارت نواز رویّے کی وجہ سے اسے ابھی تک کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی، جغرافیائی طور پر ایک چھوٹا سا اسرائیل اپنی حالیہ جنگی کارروائی کے باوجود ہمارے لئے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن یورپ کے آخری کونے سے لے کر بحرین تک پھیلے ہوئے عرب ملک ہمارے لئے بے حد اہمیت رکھتے ہیں، ہمارے لئے انتہائی ضروری ہے کہ نہر سویز اور عرب کی خلیج کے علاقے جن میں عدن جیسی بندرگاہیں بھی شامل ہیں دوست ہاتھوں میں رہیں۔ اسرائیل کے حمائتیوں کی بات مان کر ہم اپنے دشمنوں کی یہ چال ہی کامیاب کریں گے کہ اس سارے علاقے سے ہندوستان کا پتا کٹ جائے۔

یاد رکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ کچھ ہی دیر بعد عدن، بحرین، قطار اور مسقط عمان اور جنوبی عرب کے کئی علاقے برطانوی چنگل سے آزاد ہونے والے ہیں، ان علاقوں میں عرب دنیا کے دوسرے ملکوں کی طرح عرب قوم پرستی بھی بے حد مضبوط ہے، اور اسرائیل کے خلاف جذبہ بھی۔ فوجی، مالی اور سیاسی اعتبار سے ہمارے لئے یہ بے حد ضروری ہے کہ یہ سب ہی علاقے ہندوستان کے دوست رہیں۔ عربوں کے خلاف اسرائیل نواز پالیسی اپنا کر نہ صرف ہم اپنے آرتھک فائدے کو سراسر نقصان میں بدل ڈالیں گے بلکہ ایک بہت بڑے علاقے کو خواہ مخواہ اپنا دشمن بنا لیں گے۔ اسرائیل کے حامیوں میں ایک بڑی تعداد سامراجیوں کے ان پٹھوؤں کی ہے جو اپنے آقاؤں کے مفاد کے سامنے ملک کے بدترین نقصان کی پروا بھی نہیں کرتے یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ہندوستان اپنے قدرتی محور سے کٹ کر سامراج کا دم چھلا بن جائے۔

چین اور عرب

جہاں تک چین اور عرب کا تعلق ہے تیرہ آزاد عرب ملکوں میں سے سات چین کی کمیونسٹ سرکار کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اردن، کویت اور سعودی عرب کھلم کھلا چین کے خلاف ہندوستان کی حمایت کا اعلان کر چکے ہیں۔ چین کی بے پناہ مدد کی وجہ سے دو تین عرب ملکوں کے ساتھ چین کے اچھے تعلقات ضرور ہیں مگر انہوں نے بھی بہت صفائی سے کہہ دیا ہے کہ وہ بھارت اور چین کے جھگڑے میں کسی فریق کا ساتھ نہیں دیتے۔ متحدہ عرب جمہوریہ نے سنہ ۱۹۶۳ء کے شروع میں کولمبو کانفرنس میں بھارت کی حمایت میں جو رول ادا کیا تھا وہ کسی تشریح کا محتاج نہیں ہے، اس کانفرنس میں مصری نمائندے وزیر اعظم علی صابری کی کوششوں ہی کی بدولت ایسی تجویزیں منظور ہوئی تھیں کہ جنہیں ہندوستان نے فوراً منظور کر لیا لیکن جنہیں چین نے اپنے خلاف سمجھتے ہوئے ابھی تک منظور نہیں کیا ہے۔ کولمبو تجویزوں سے چین کے انکار کی بدولت ہندوستان کو یہ ثابت کرنے میں بے حد مدد ملی کہ چین امن چاہتا ہی نہیں ہندوستانی پراپیگنڈے کی اس کامیابی میں مصری نمائندے کے بھارت نوازی کے رویے کا جتنا گہرا دخل ہے اسے بھلا دینا سچائی سے منہ موڑنا بھی ہے اور احسان فراموشی کی بدترین مثال بھی۔

عربوں سے ہمارے کتنے گہرے اقتصادی، سیاسی اور جغرافیائی مفاد وابستہ ہیں اس کا ذکر کرتے وقت یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اسرائیل کی ۲۶ لاکھ آبادی کے مقابلہ میں عربوں کی آبادی ۵ اکروڑ کے قریب ہے۔ اسرائیل کی جارحانہ کارروائیوں کے باوجود یہ ملک اقتصادی اور سیاسی طور پر بے حد اہمیت رکھتے ہیں گنتی میں بھی

ان کی تعداد تیرہ ہے جو جلد ہی پندرہ ہو جائے گی، اس کے علاوہ انہیں تقریباً پندرہ ہی دوسرے عرب ایشیائی ملکوں کے ووٹوں پر مکمل اختیار حاصل ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ عرب دشمن پالیسی اپنا کر ہم تقریباً تیس ملکوں کی حمایت سے بالکل محروم ہو جائیں گے۔ اس کے بدلے میں ہمیں مغربی ملکوں کے سوائے اور کوئی منہ لگانے کے لئے تیار نہیں ہوگا، یہ تو ظاہر ہی ہے کہ مغربی ملک کبھی بھی ہماری حمایت نہیں کر سکتے، گویا اگر اسرائیل کے وکیلوں کی بات ہم مان لیں تو عالمی سیاست میں ہم نہ اِدھر کے رہیں گے اور نہ اُدھر کے۔

سیدھی سی بات یہ ہے کہ عرب دنیا میں اپنے ہر قسم کے سیاسی، اقتصادی اور جغرافیائی مفاد کو دیکھتے ہوئے ہماری یہ کوشش ہونی چاہئے کہ وہاں ہمارے زیادہ سے زیادہ دوست موجود ہوں۔ اس لئے ہمیں عربوں کو یہ یقین دلاتے رہنا چاہئے کہ ہم ہی ان کے بہترین دوست ہیں، اسرائیل کی حامی پالیسی اپنانے سے جتنی خوشی ہمارے مخالفوں کو ہوگی اتنی تو شائد خود اسرائیل کو بھی نہ ہو۔

خاص حیثیت

بعض اسرائیل پرست حلقے بار بار یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر روس، جاپان، برما، نیپال، لنکا اور کئی دوسرے ملکوں نے اسرائیل کو تسلیم کرکے اس کے ساتھ تجارتی اور سفارتی تعلقات قائم کر لئے ہیں تو ہندوستان کو بھی ایسا ہی کرنا چاہئے اگر ان سب ہی ملکوں کے ساتھ عرب ملک بگاڑ پیدا نہیں کر سکے تو عرب ہندوستان کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بنیادی طور پر یہ بات بالکل غلط بھی ہے اور حقیقت کے تقاضوں سے پردہ پوشی کے برابر بھی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کا شروع

ہی سے یہ رویہ رہا ہے کہ ہم نے فلسطین پر جارحانہ صیہونی قبضے کی کبھی حمایت نہیں کی ہے۔ پچھلے ۳۰ سال سے ہم عربوں کی حمایت میں آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ اب اگر ہم نے اس معاملے میں قلابازی کھائی تو ۳۰ برسوں کی پالیسی نہ صرف جھوٹی پڑ جائے گی بلکہ عرب دنیا میں ہم نے جو عزت اور احترام حاصل کیا ہے وہ بھی ختم ہو جائے گا، دوسری بات یہ ہے: جیسا کہ اسٹیٹسمین کے نامہ نگار مسٹر جینسن نے لکھا ہے کہ اقتصادی اعتبار سے جتنی ضرورت ہمیں عربوں کی ہے اتنی شائد عربوں کو ہماری نہیں ہے، جو کچھ ہم عربوں کو دیتے ہیں وہ کئی دوسرے ملکوں سے بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن عرب دنیا میں ہمارے لئے جو اقتصادی موقعے ہیں وہ شائد ہمیں اور کہیں حاصل نہیں ہو سکتے، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں عربوں سے ہمیں اربوں روپے سالانہ کا قومی فائدہ بھی ہوتا ہے اور لاکھوں ہندوستانی عرب دنیا کے مختلف حصوں میں انتہائی خوشحالی کی زندگی بھی بسر کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ عالمی برادری میں ایک بہت بڑا بلاک عرب ملکوں کا اب بھی موجود ہے۔ یہ کہاں کی دانشمندی ہوگی کہ ہم ۱۵ عرب ملکوں اور ان کے کم از کم پندرہ مزید حامیوں کو محض ایک اسرائیل کو خوش کرنے کے لئے ناراض کر لیں، مغربی خیرات پر مستقل پلنے والے ۲۵ لاکھ یہودیوں کو ۱۲ کروڑ سے زائد آزاد عربوں پر ترجیح دینا سیاسی خودکشی کے برابر ہے اور اپنے اقتصادی پیروں پر آپ کلہاڑی مارنے کے مترادف بھی، یہ کہنا بھی قطعاً غلط ہے کہ ہندوستان کا مقابلہ کچھ ایسے چھوٹے چھوٹے ملکوں سے کیا جا سکتا ہے جن کے رویے کی عرب کچھ زیادہ پروا نہیں کرتے، ایسے لوگوں کی عقل کا ماتم منانا چاہئے جو ہندوستان کو اتنے چھوٹے چھوٹے ملکوں کا ہم پلہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں، صاف ظاہر ہے

کہ ایسے ملکوں سے عربوں کے بہت زیادہ تجارتی، اقتصادی، سیاسی اور ذہنی رشتے کبھی تھے ہی نہیں، یہ ملک کچھ بھی رویّہ اختیار کرلیں عربوں کو ذہنی طور پر کوئی خاص تکلیف نہیں پہنچتی لیکن ہندوستان کے ساتھ اتنے گہرے رشتے ہیں کہ اس سے توقعات بھی اتنی ہی زیادہ ہیں، ہمارے کسی بھی غلط قدم سے ان توقعات کو جو ٹھیس پہنچے گی اس سے ہندوستان کے سوائے اور کسی کا سیاسی یا اقتصادی نقصان نہیں ہو سکتا۔

اس سے بھی اہم بات وہ خطرہ ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متحدہ عرب جمہوریہ کے اعلیٰ نمائندہ ڈاکٹر محمود فوزی نے اقوام متحدہ کے ہر ممبر خصوصاً افریشیائی اقوام کو ان الفاظ میں وارننگ دی تھی۔ "سنہ ۱۹۵۶ء میں مصر پر حملہ ہوا تھا، اِس بار شام اور اردن بھی حملے کا شکار ہو گئے، اب کس کی باری ہے؟ آپ کی، آپ کی، اور آپ کی، افریقہ، ایشیا، لاطینی امریکہ، بلقان اور خدا جانے کس کس کو اسرائیلی جارحیت کا اگلا شکار بننا پڑے گا۔"

(پیٹریاٹ ۲۲ جون سنہ ۱۹۶۷ء)

قومی آدرشوں کا تقاضا

بعض لوگ اسرائیل کی جارحیت کے خلاف ہندوستان کے زوڈوک رَیّے پر حیرت کا اظہار کرتے ہیں ان لوگوں کو شاید یہ علم نہیں ہے کہ ہندوستان نے جو پالیسی اب اپنا رکھی ہے وہ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ ہماری قومی تحریک۔ اس پالیسی کو بدلنے کا مطالبہ صرف وہی لوگ کرسکتے ہیں جو ہماری قومی تحریک اور اس کے اصولوں سے نہ کوئی تعلق رکھتے ہیں اور نہ عقیدت۔

گاندھی جی نے ۱۹۳۶ء ہی میں فلسطین پر یہودی دعوؤں کو رد کرتے ہوئے انتہائی صفائی کے ساتھ یہ لکھا تھا "یورپ کے مظلوم یہودیوں سے مجھے پوری ہمدردی ہے لیکن اپنی ہمدردی کی بدولت میں انصاف کے تقاضوں کو نظرانداز نہیں کرسکتا یہودیوں کے لئے ایک قومی گھر کا نعرہ مجھے بالکل نہیں بھاتا، فلسطین اسی طرح عربوں کا ہے جیسے انگلستان انگریزوں کا اور فرانس فرانسیسیوں کا، یہودیوں کو عربوں پر مسلط کرنا بالکل غلط ہے اگر فلسطین کے بجائے یہودیوں کو اور کسی ملک میں رہنے کا حق نہ دیا گیا تو کیا انہیں یہ پسند ہوگا کہ وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر فلسطین میں آباد ہو جائیں؟ یا یہ وہ دو گھر چاہتے ہیں جہاں اپنی مرضی کے مطابق رہتے ہیں۔ یہودیوں کے لئے یہ بالکل نامناسب ہے کہ وہ انگریزوں کی بندوقوں کے سائے میں فلسطین میں داخل ہونے

کی کوشش کریں ایسی صورت میں ہزار مشکلوں کے باوجود عربوں کی مزاحمت بالکل جائز بھی ہے اور مناسب بھی "۔ (ہریجن ۲۶ / نومبر ۱۹۳۸ء)

تحریک آزادی کے دوران انڈین نیشنل کانگریس نے کئی بار فلسطین کے عربوں سے گہری ہمدردی اور ان کی پرزور حمایت کا اعلان کیا تھا۔ ۱۹۲۸ء ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۸ء میں کانگریس نے اپنے اجلاسوں کے دوران فلسطین میں برطانوی چالوں کی پرزور مذمت کرتے ہوئے اپنی کئی ریزولیوشنوں میں بار بار یہ کہا تھا کہ فلسطین ایک عرب ملک ہے اور اس پر عربوں ہی کا اختیار رہنا چاہئے۔ ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے ایک ریزولیوشن کے دوران فلسطین کی مجوزہ تقسیم کی پرزور مذمت کی تھی اور یہ کہا تھا کہ برطانوی سامراج کو ایسی تمام چالوں سے باز رہنا چاہیے جن سے فلسطین پر وہاں کے مقامی باشندوں یعنی عربوں کے حقوق مجروح ہونے کا اندیشہ ہے۔ فروری ۱۹۳۸ء میں کانگریس نے اپنے ہری پورہ کے اجلاس میں مندرجہ ذیل ریزولیوشن منظور کیا تھا۔

"کانگریس حکومت برطانیہ کے اس فیصلہ کی پُرزور مذمت کرتی ہے کہ فلسطین کی تقسیم کی کوشش کی جائے، کانگریس ان سامراجی کوششوں کے خلاف سخت احتجاج کرتی ہے کہ جس کا مطلب فلسطین کے مظلوم عرب باشندوں پر طرح طرح کے مظالم توڑ کر انہیں ان کے جائز حقوق سے محروم کرنا ہے۔ کانگریس عربوں سے پوری ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے یہ یقین دلاتی ہے کہ برطانوی سامراج کے خلاف قومی آزادی کی جنگ میں وہ پوری طرح ان کے ساتھ ہے"۔

پنڈت نہرو نے ۳۷-۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۸ء میں ماڈرن ریویو کلکتہ "ہند"

مدراس اور نیشنل ہیرلڈ لکھنؤ میں اسی مسئلے کی وضاحت کرتے ہوئے فلسطین پر عربوں کے حقوق کی مکمل وضاحت کی تھی۔ ۱۹۳۸ء میں نیشنل ہیرلڈ میں انہوں نے ایک مضمون کے دوران صاف صاف لکھا تھا کہ فلسطین ایک عرب ملک ہے اور وہاں پر عرب مفاد اور عرب حقوق ہی کو برتری حاصل ہونی چاہیئے۔ ۱۹۳۶ء میں انہوں نے ماڈرن ریویو میں ایک مضمون کے دوران بیلفور اعلان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہ عربوں سے انگریزوں کی غداری کی سب سے شرمناک مثال ہے۔ انہوں نے یہ خیال بھی ظاہر کیا تھا کہ یہ صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ ایشیا کی آزادی کی تحریکیں مضبوط نہیں تھیں ورنہ اگر ایشیائی ملکوں میں عوامی تحریکیں منظم ہوتیں تو انگریزوں کو عرب حقوق پر اس طرح چھاپہ مارنے کی ہمت کبھی نہ ہوتی۔

یہ بھی یاد رہے کہ اس زمانہ میں بھی کئی اہم صیہونیت پرست یہودیوں نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ گاندھی جی، پنڈت نہرو اور ہماری قومی تحریک کو عربوں کی حمایت کے راستے سے ہٹا لیں۔ اس سلسلے میں یہ جھوٹ بھی پھیلایا گیا کہ گاندھی جی صرف مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے عربوں کی حمایت کر رہے ہیں۔ ۱۹۴۲ء اور اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہریجن میں شائع شدہ دو مضمونوں میں گاندھی جی نے ان الزامات کی پُرزور الفاظ میں تردید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ سچ کا ساتھ تب بھی دیں گے جبکہ ان کا حامی خدا کے سوائے اور کوئی نہ ہو۔ اگست ۱۹۴۷ء میں ایک مضمون کے دوران انہوں نے برصغیر پر ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات پر آنسو بہاتے ہوئے اپنے قارئین کو "ایک اور المیہ" کی یاد بھی دلائی جہاں معصوم لوگوں کو تنگ نظری اور دہشت پسندی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ انہوں نے لکھا "یہودیوں نے پہلے یہ بھیانک غلطی کی تھی کہ انہوں نے انگریزوں اور

امریکیوں کی مدد سے اپنے آپ کو فلسطین پر مسلط کرنا چاہا تھا اب وہ اس سے بھی بڑی غلطی برہنہ دہشت پسندی کے طریقوں کو اپنا کر کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جس سرزمین پر انہیں کوئی پسند نہیں کرتا وہاں وہ انگریز ہتھیاروں اور امریکی سرمائے کی مدد سے گھسنا کیوں چاہتے ہیں"؟ گاندھی جی عام طور پر ایسی سخت زبان لکھنے کے عادی نہیں تھے مگر ان کی یہ تحریریں ظاہر کرتی ہیں کہ انہیں اسرائیلی سامراجیت اور صیہونی دہشت پسندی کے بھیانک روپ سے اس قدر آگاہی تھی کہ انہوں نے سخت ترین الفاظ میں اس کی مذمت سے گریز نہیں کیا۔

اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ہندوستان نے اپنی آزادی کے فوراً بعد اقوام متحدہ میں فلسطین کے بارے میں قائم کئے گئے گیارہ طاقتی کمیشن میں فلسطین کی تقسیم کی پرزور مخالفت کی تھی، عام اسمبلی میں بھی ہندوستان نے حتی المقدور پوری کوشش کی کہ تقسیم کا ریزولیوشن پاس نہ ہونے پائے یہ بات اور ہے کہ سامراجی چالوں کے سامنے اس کی پیش نہ چلی۔

باپو کے نقشِ قدم پر

اسرائیل کے قیام کے بعد ہندوستان نے ہر قسم کے دباؤ کے باوجود اس سے سفارتی تعلقات قائم کرنا گوارا نہ کیا، ہندوستان اور اس کے رہنما بار بار عرب مہاجرین کے حقوق کی حفاظت کرتے رہے ہیں، ۱۸ نومبر ۱۹۵۶ء کو لوک سبھا میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے مصر پر تین طاقتی سامراجی حملے کی مذمت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ یہ حملہ ایک طرح سے ہندوستان اور سب ہی ایشیائی افریقی ملکوں کی آزادی پر حملہ ہے ہمارا قومی مفاد تقاضہ کرتا ہے کہ ہم عرب عوام کی آزادی کی پُرزور حمایت کریں اور

اسرائیلی توسیع پسندی کی پُر زور مذمت۔

۱۹۶۳ء میں پنڈت نہرو نے ہندوستان کی طرف سے نئی دلی میں مقیم عرب سفیروں کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستان دریائے اردن کے پانی کے معاملے میں عرب موقف کی مکمل حمایت کرتا ہے۔ ۱۹ ر دسمبر ۱۹۶۴ء کو ہند عرب تعلقات کے ایک سیمنار میں تقریر کرتے ہوئے جواہر لال نہرو ہی کے عظیم جانشین سورگیہ شری شاستری نے یہ کہا تھا کہ ہندوستان دریائے اردن اور عرب مہاجرین سے متعلقہ مسائل پر عرب نقطۂ نظر سے مکمل طور پر متفق ہے، انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ اس سلسلے میں اپنے جائز حقوق کی حفاظت کے لئے عرب ملک جو بھی قدم اٹھانا مناسب سمجھیں گے ہم اس کی حمایت کریں گے۔

نومبر ۱۹۶۶ء میں اسرائیل نے جب اردن کے گاؤں سموہ پر حملہ کیا اور وہاں کے سیکڑوں بے گناہ عرب باشندوں کو جارحانہ دہشت پسندی کا شکار بنایا تو حکومت ہند نے واضح ترین الفاظ میں ایک سرکاری بیان کے ذریعہ اس کی مذمت کی اس بیان میں کہا گیا کہ "ہم اسرائیل کے ان شرمناک اقدامات کی پرزور مذمت کرتے ہوئے یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ اسرائیلی حکومت اپنی ان ذمہ داریوں سے انکار نہیں کر سکتی۔ اتنے مذموم طریقے سے طاقت استعمال کر کے اسرائیل نے نہ صرف جنگ بندی کے معاہدے کی قطعی خلاف ورزی کی ہے بلکہ اقوام متحدہ کے منشور اور سلامتی کونسل کی طاقت، کو جھٹلانے کی بھی کوشش کی ہے۔ اسرائیل حکومت کو جان لینا چاہئے کہ عالمی رائے عامہ کسی قسم کے سوچے سمجھے جارحانہ اقدامات کو معاف نہیں کر سکتی۔

حالیہ جنگ سے کچھ پہلے بھی ہند سرکار نے اپنا رویہ بالکل صاف اور واضح کر دیا

تھا۔ اس وقت کے وزیر خارجہ شری چھاگلہ نے اپنے ۲۳ مئی کے بیان میں یہ واضح کر دیا تھا کہ ہم آبنائے طیران پر مصر کی بالادستی کو پوری طرح تسلیم کرتے ہیں۔ انہوں نے بیان کے شروع ہی میں کہا تھا کہ اسرائیل کی تشکیل کے ساتھ ہی ساتھ وسط مشرق میں کئی قسم کے تنازعے پیدا ہوتے رہے ہیں، ہند سرکار یہ سمجھتی ہے کہ ان کی بنیاد یہ ہے کہ عرب حقوق کا مناسب تحفظ نہیں کیا گیا۔"

موجودہ پالیسی

سلامتی کونسل کے رکن کی حیثیت سے ہندوستان نے امن اور انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے مظلوم عربوں کی پوری حمایت کی ہے اور اسرائیل کی پر زور مذمت۔ امن قائم رکھنے ہی کے خیال سے ہندوستان نے سلامتی کونسل میں ۲ جون کو اپنا مشہور پانچ نکاتی پروگرام پیش کیا تھا اس میں سفارش کی گئی تھی کہ اقوام متحدہ کی طرف سے فوراً ایسے فوجی مبصر بھیجے جائیں جو دونوں طرف جا کر مغربی ایشیا میں امن قائم رکھنے کی کوشش کریں، یہ بھی تجویز کیا گیا کہ عربوں اور اسرائیلیوں اور اقوام متحدہ کے فوجی نمائندوں پر مشتمل وہ جنگ بندی کمیشن دوبارہ کام کرنا شروع کر دیں جو اسرائیلی بائیکاٹ کے باعث معطل پڑے ہیں۔ اگر ان تجویزوں کو مان لیا جاتا تو اسرائیل کے لئے حالیہ جارحانہ کارروائی کرنا آسان نہ ہوتا، عین اسی لئے امریکہ برطانیہ اور اسرائیل کی پر زور مخالفت کے باعث یہ تجویز نامنظور کر دی گئی۔ ۶ جون ۱۹۶۷ء کو پارلیمنٹ میں اپنا شہرۂ آفاق بیان دیتے ہوئے شریمتی گاندھی نے صاف صاف کہا تھا کہ ہمارے پاس آنے والی اطلاعات کی بنا پر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ تنازعہ کو جنگ کی شکل دینے کی مکمل ذمہ داری اسرائیل کی ہے۔

دلی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے شریمتی گاندھی نے کہا کہ طاقت کے ذریعہ سرحدوں میں تبدیلی کا اصول ہندوستان کبھی تسلیم نہیں کر سکتا، ہم مغربی ایشیا میں امن کے قیام سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں لیکن ایک بات بالکل صاف ہے کہ ہم کسی ایسے ملک کی پالیسی کی حمایت نہیں کر سکتے جو جارحیت سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہو، انصاف اور دھاندلی کی ٹکر میں ہندوستان غیر جانبدار نہیں رہ سکتا۔ (ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی ۲۶ جون ۱۹۶۷ء)

وزیر دفاع سردار سورن سنگھ نے اسی موقف کو دہراتے ہوئے پارلیمنٹ میں کہا کہ ہندوستان عربوں کی حمایت کر رہا ہے کیونکہ وہ بدترین قسم کی عریاں جارحیت کا شکار ہوئے ہیں۔ (پیٹریاٹ ۲۵ جون ۱۹۶۷ء)

سابق وزیر خارجہ جناب ایم سی چھاگلہ نے اقوام متحدہ کی عام اسمبلی کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ سب سے پہلے ہمیں اس بات کی طرف متوجہ ہونا چاہئے کہ اسرائیل عرب علاقوں سے اپنی فوجیں فوراً اور غیر مشروط طور پر واپس ہٹا لے۔" عالمی ادارے کو متنبہ کرتے ہوئے انہوں نے مزید کہا کہ اگر ہم آج یہ اصول مان لیتے ہیں کہ فاتح اقوام متحدہ کو جھٹلانے کا حق رکھتا ہے تو پھر بہتر یہی ہوگا کہ منشور کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھاڑ کر پھینک دیں اور جس کی لاٹھی اسی کی بھینس کے اصول کو تسلیم کر لیں۔ (ٹائمس آف انڈیا نئی دہلی، ۲۳ جون ۱۹۶۷ء)

جنگ کے دوران اور اس کے بعد ہندوستان نے عربوں کی حمایت کا جو رویہ اختیار کیا اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں رہی، سب ہی عرب ملک اپنے رہنماؤں اور نمائندوں کی معرفت انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ہندوستان کی پالیسی

کا پرزور شکریہ ادا کر چکے ہیں۔ ایسے رہنماؤں میں صدر ناصر، صدر بومحی الدین شاہ حسین، شاہ فیصل اور صدر الازہری بھی شامل ہیں۔

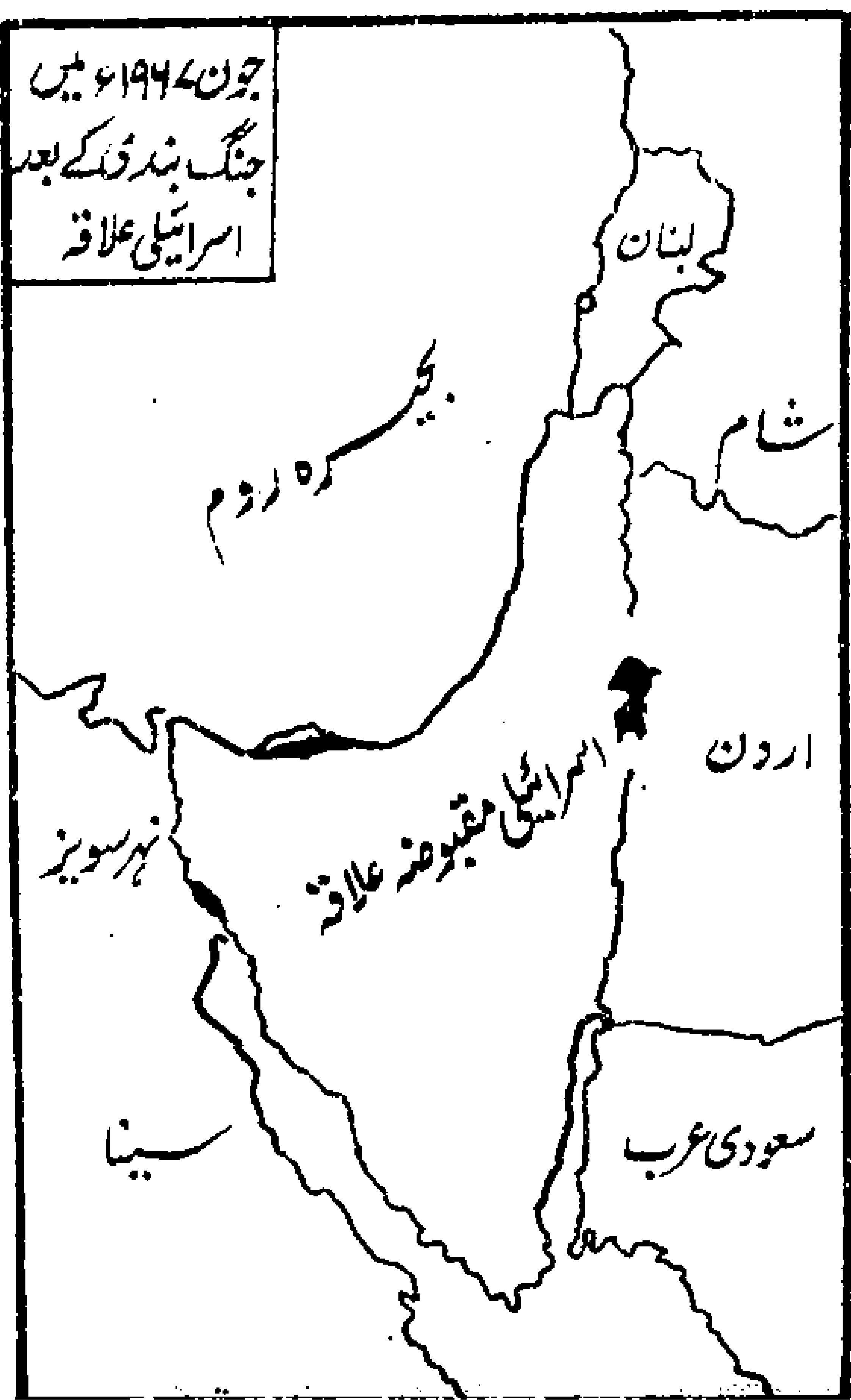
ہندوستان نے یہ رویہ جن اصولوں کی بنا پر اپنایا وہ ہماری تیس برس کی قومی پالیسی میں نمایاں رہے ہیں، شریمتی اندرا گاندھی نے ان ہی اصولوں کا خلاصہ انتہائی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ قاہرہ کے اخبار "الاہرام" کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "ہم اسرائیل کی مخالفت صرف عربوں سے دوستی کی بنا پر ہی نہیں کرتے، ہم اسرائیل کی مخالفت اس لئے بھی کرتے ہیں کہ ہم مذہبی تنگ نظری کی بنا پر قائم ریاستوں کی حمایت نہیں کر سکتے اور نہ ہی جارحانہ طریقوں سے ہتھیائے ہوئے علاقوں پر قبضے کو جائز تسلیم کر سکتے ہیں۔

(الاہرام ۱۰ ار جولائی ۱۹۶۶ء)

عرب اسرائیل، خونیں حدود



مسلسل جارحیت نقشوں کی روشنی میں



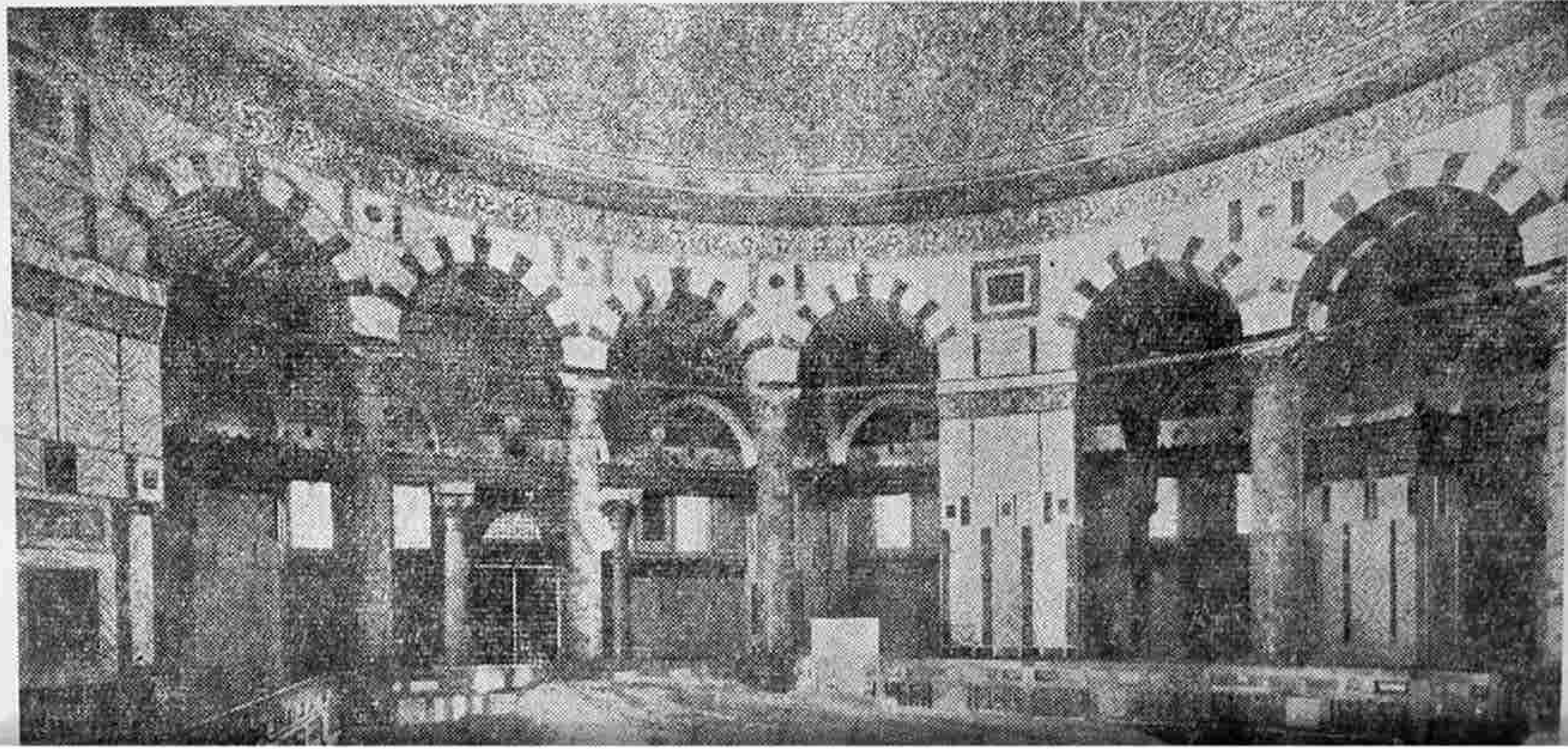


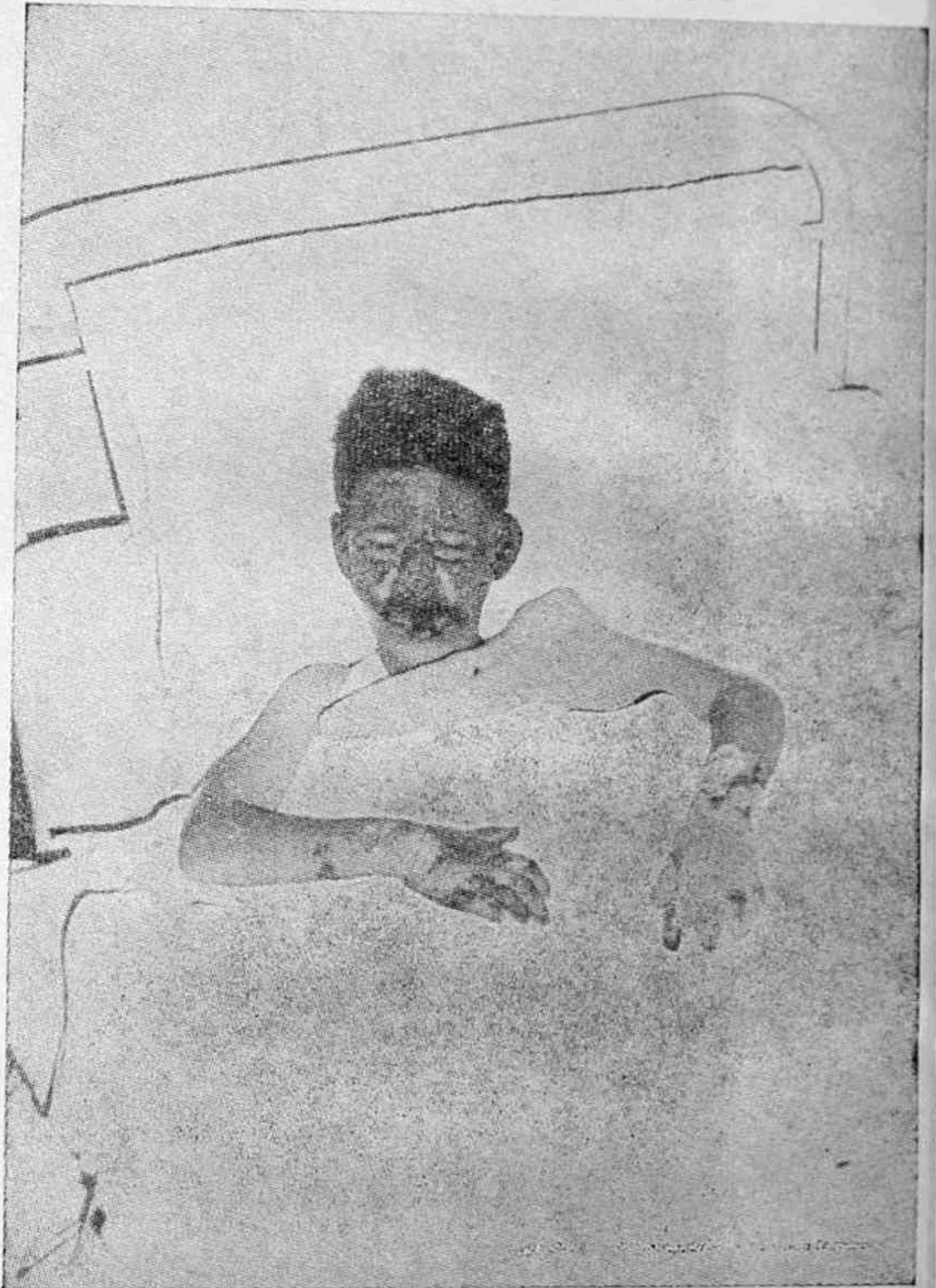




مجھے چاہیئے "امّی ابّا اور گھر؟"

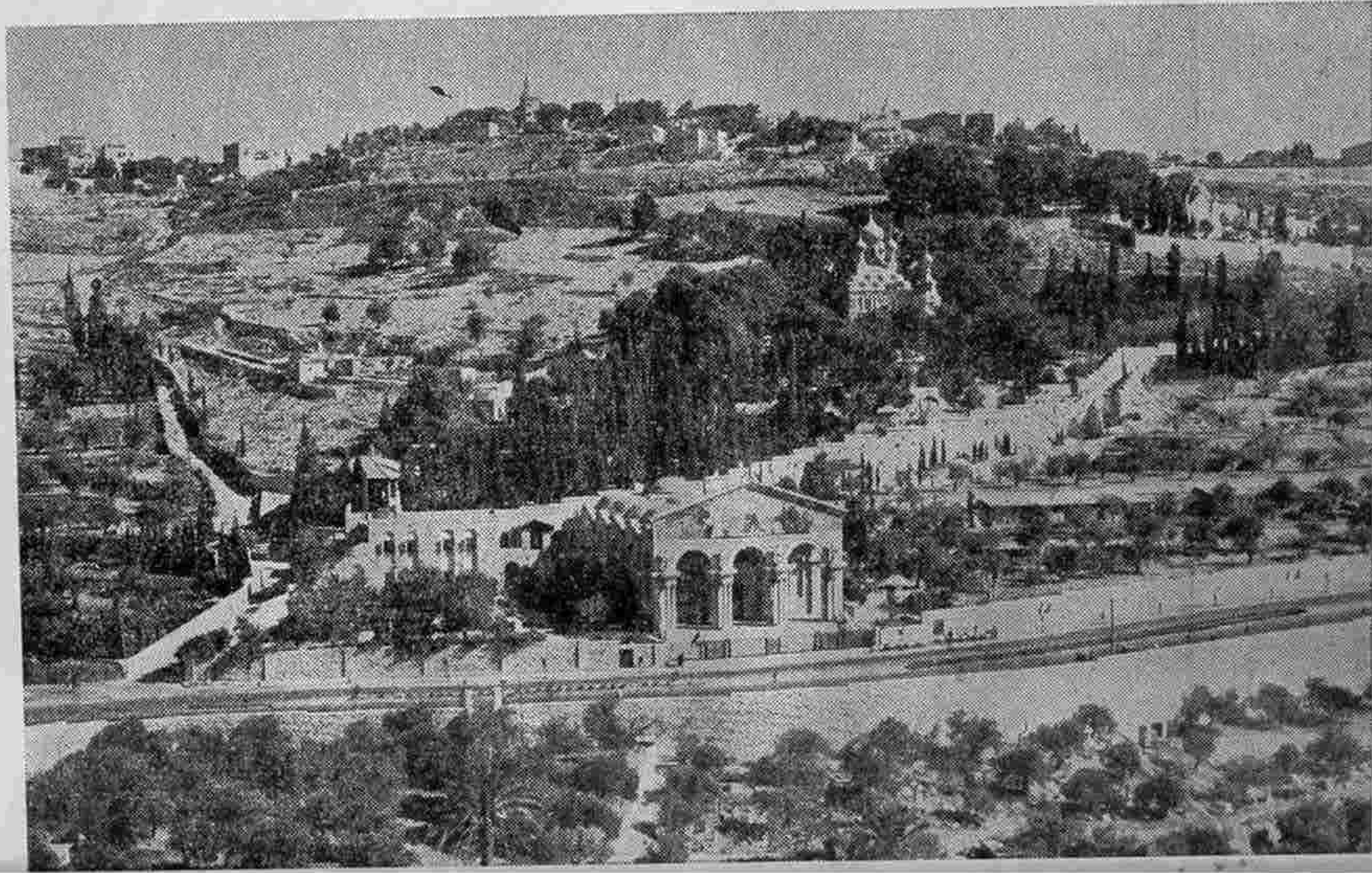
مسجدِ اقصیٰ کا اندرونی حصہ، منقش لکڑی کے جنگلے کے اندر وہ مقدس چٹان ہے۔ جہاں سے پیغمبرِ اسلامؐ معراج کے لئے تشریف لے گئے۔



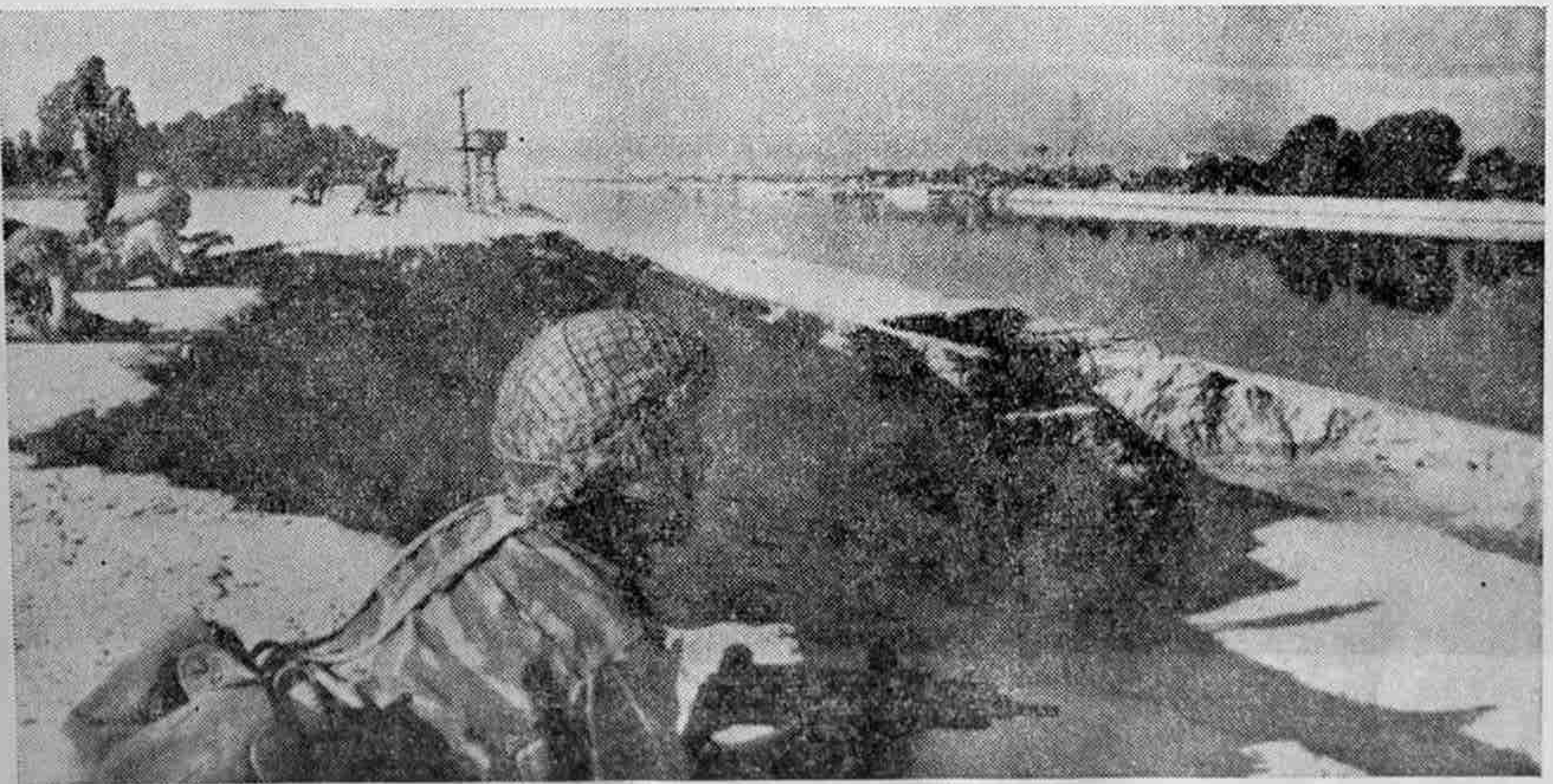


نئے فرعونوں کے "وہ کارنامے" جنہیں دیکھ کر ہٹلر کی روح بھی شرما گئی ہوگی۔

بیت المقدس، یروشلم۔ فوٹو گرافر کی طایرانہ نگاہ میں

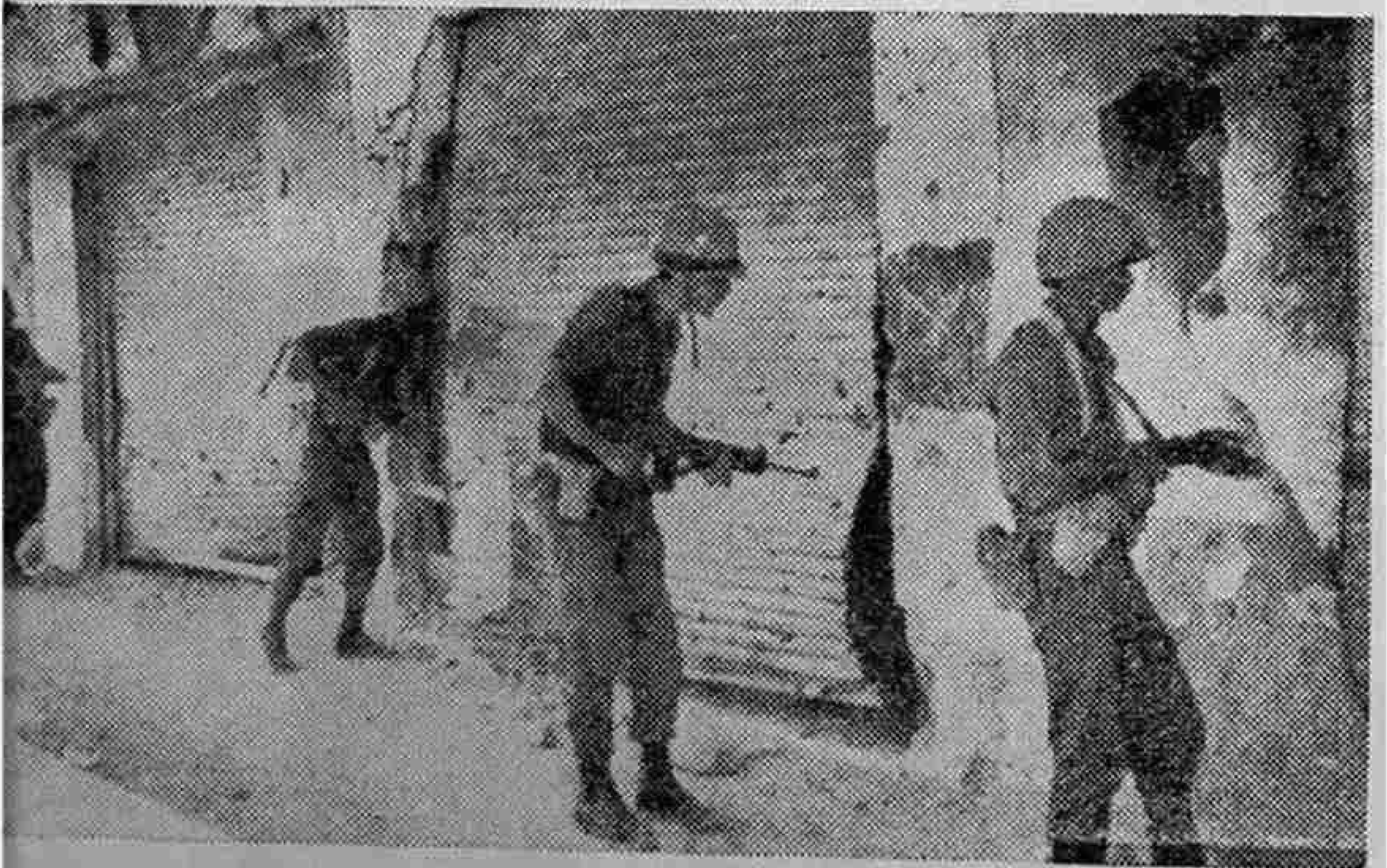


نہر سویز کا مشرقی کنارہ۔ اسرائیلی حملہ آوروں کی منحوس صورتیں صاف نظر آ رہی ہیں۔



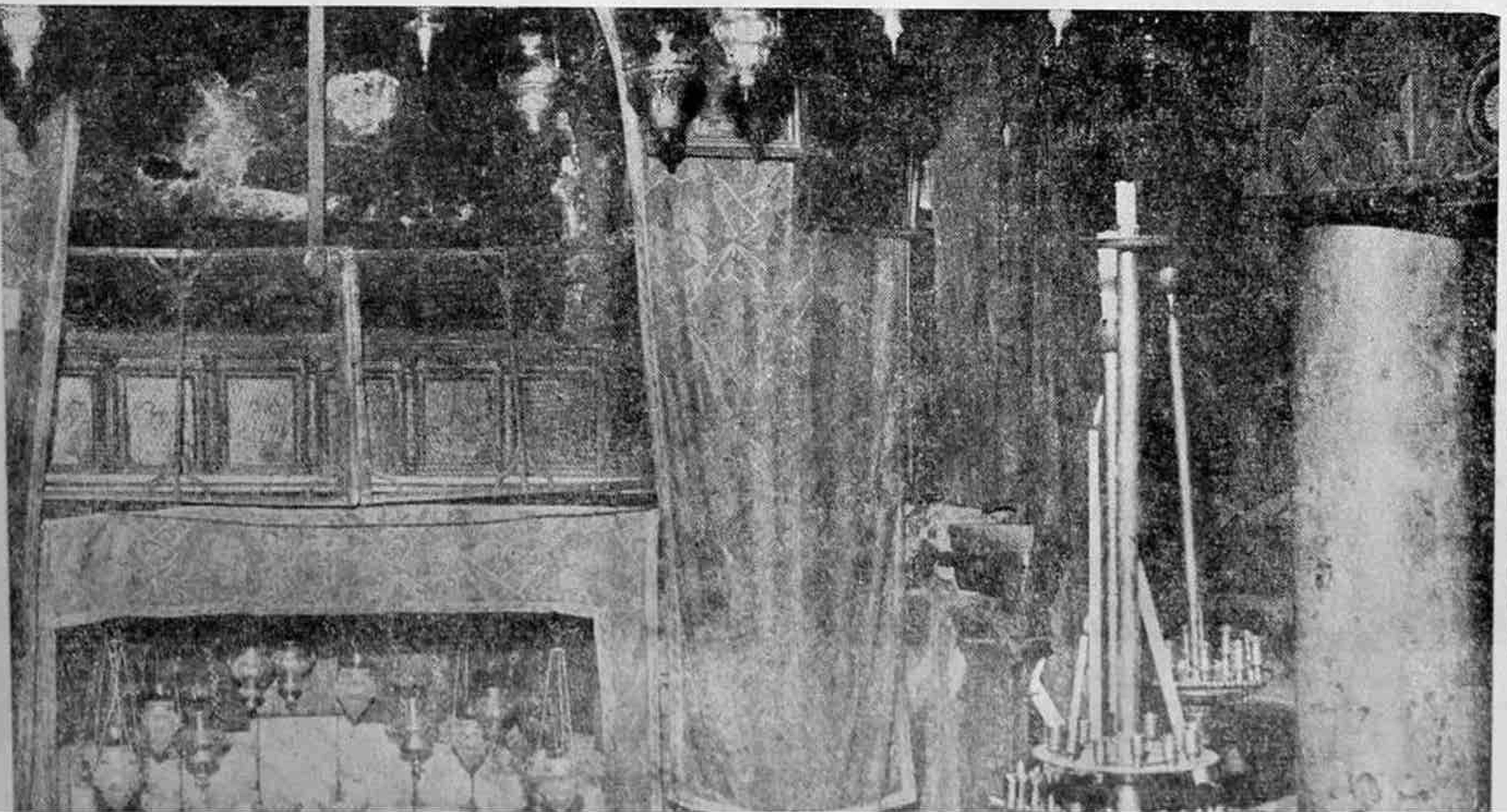


ایک امریکی "اسرائیلی" پائیلٹ جس نے گرفتاری کے بعد کئی راز فاش کر دیئے۔



اسرائیلی فوجی عرب گھروں کو خالی کرواتے ہوئے

بیت اللحم ـــــــ حضرت عیسےٰ کی جائے پیدائش



نیپام بم کا ایک شکار



"ہم اپنے گھروں کو واپس کب جائیں گے؟"



عرب نوجوانوں کا عزم ۔ مادرِ وطن کی آزادی یا موت ۔



ضی ناکامی کے باوجود فتح کا یقین

عرب اور اسرائیل

پہلا انگریزی ایڈیشن — مئی ۱۹۶۶ء

دوسرا ترمیم شدہ ایڈیشن — ستمبر ۱۹۶۶ء

تیسرا ترمیم شدہ ایڈیشن — دسمبر ۱۹۶۶ء

چوتھا ایڈیشن — فروری ۱۹۶۷ء

پانچواں ایڈیشن اضافے اور ترمیم کے ساتھ جنوری ۱۹۶۸ء

پہلا ہندی ایڈیشن — جولائی ۱۹۶۷ء

دوسرا ہندی ایڈیشن — جنوری ۱۹۶۸ء

عربی ترجمہ، شائع کردہ روزنامہ "خلیج العربی" (بغداد)
جولائی ۱۹۶۶ء

اردو ایڈیشن پہلی بار — جنوری ۱۹۶۸ء

کتبہ مقصود علی خاں — مطبوعہ جمال پریس دہلی

افرو ایشین پبلیکیشنز

سی-۷۰ نظام الدین ایسٹ۔ نئی دہلی-۱۳
فون نمبر ۶۱۹۶۱۵

اس کتاب میں

عرب اسرائیل جنگ کے کئی سربستہ راز

عربوں کے خلاف سامراجی سازشیں

ارض مقدس پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کی تاریخی کڑیاں

عرب مہاجرین کی آنسو بھری کہانی

عربوں کی جدوجہد آزادی کی ولولہ انگیز داستان

اسرائیلی "ترقی" اور طاقت کی اصل حقیقت

صیہونی فلسفی یا ہٹلر کے استاد

اقوام متحدہ کا سب سے بڑا مجرم

عرب اور اسرائیل — ہندوستان کے لئے

مغربی ایشیا کا مستقبل، جنگ یا امن؟

ہندوستان کدھر اور کیوں؟

اور

متعدد نادر تصاویر اور معلوماتی نقشے

قیمت دو روپے پچاس پیسے

منورما دیوان ایک بے باک مبصر کی حیثیت سے انگریزی ہندی اور اردو صحافت میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔

۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے امتیازی شان کے ساتھ سیاسیات میں ایم۔اے کرکے روزنامہ ملاپ کے ساتھ بطور خصوصی نمائندہ منسلک ہوگئیں، اسی حیثیت سے وہ دس عرب ملکوں کا طویل سفر بھی کر چکی ہیں،

شریمتی دیوان کے انگریزی مضامین ممتاز انگریزی جریدوں 'ہندوستان ٹائمز'، 'ہندو' ٹائمز آف انڈیا، اور ٹریبیون کے علاوہ سرکردہ ہندی روزنامہ "آج" بنارس اور ماہنامہ "سریتا" میں بھی اکثر شائع ہوتے رہے ہیں، اردو میں وہ ملاپ، سیاست (حیدرآباد) اور سیاست جدید (کانپور) ایسے اہم روزناموں کے علاوہ ماہنامہ "بانو" میں بھی عام طور پر لکھتی رہی ہیں۔

شریمتی دیوان پنجاب کے مشہور انقلابی مصنف پرنسپل چھبیل داس اور سرکردہ سماجی کارکن شریمتی سیتا دیوی (ایم، ایل، سی) کی صاحبزادی اور مشہور ادیب دیوان بیریندر ناتھ ظفر پیامی کی رفیقۂ حیات ہیں۔ آج کل وہ دہلی میں مقیم ہیں اور ملکی اور غیر ملکی اخباروں میں لکھنے کے علاوہ ریڈیو اور ٹیلی ویژن براڈکاسٹ میں بھی اکثر حصہ لیتی رہتی ہیں۔

منور مادیوان کی زیر نظر کتاب اُن کی اُس انگریزی تصنیف کا ترجمہ ہے جو بقول محمد حسنین ہیکل چیف ایڈیٹر "الاہرام" قاہرہ "عرب اسرائیل تنازعے پر اپنی قسم کی بہترین کتاب کی حیثیت رکھتی ہے"، مئی ۱۹۶۶ء میں اس کا پہلا ایڈیشن شایع ہوا۔ اب تک اس کے پانچ انگریزی ایڈیشنوں کے علاوہ ہندی اور عربی ترجمے بھی چھپ چکے ہیں، بنگالی، ملیالم، تامل، فرانسیسی اور فارسی تراجم جلدی ہی شایع ہونے والے ہیں۔

قبولِ عام کی اس سند کے علاوہ صدر جمال عبدالناصر، شریمتی اندرا گاندھی، سردار سورن سنگھ، جناب ایم، سی چھگلہ اور دوسرے کئی عرب اور ہندوستانی رہنما منور مادیوان کے اِس تاریخی کارنامے کی داد دے چکے ہیں۔

نئی دہلی میں مقیم سب ہی عرب ملکوں کے سفیر اور نمائندے اپنی ایک میٹنگ میں متفقہ طور پر مصنّفہ کے کام کے لئے دلی شکریہ ادا کر چکے ہیں، بغداد کے روزنامہ "خلیج العربی" نے اس کتاب کو "گاندھی اور نہرو کی سرزمین سے عربوں کی حمایت میں اٹھنے والی سب سے مدلّل پُرزور اور ناقابل تردید آواز" کا نام دیا ہے۔

انگریزی کے سرکردہ روزنامہ "میل" مدراس کے الفاظ میں "منور مادیوان کی کتاب کو نہ عربوں کے حامی نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ اسرائیل کے دوست، ہم خود ان کے نظریات سے اتفاق نہیں رکھتے لیکن ان کی محنت معلومات کی ہمہ گیری، پُرزور انداز بیان اور ٹھوس دلیلوں کی تائید کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

زیر نظر ترجمہ کرتے وقت مصنّفہ نے وہ کئی اہم اضافے بھی کر دیئے ہیں جو حالیہ جنگ کے باعث ضروری ہو گئے تھے، اس اعتبار سے کتاب کا اردو روپ انگریزی کے مقابلہ میں کہیں زیادہ طویل بھی ہے اور ہمہ گیر بھی۔



(المیہ فلسطین ماضی، حال اور مستقبل کے آئینے میں)

عرب اور اسرائیل

منورما دیوان